McGill University Library
3 103 089 959 5
ISLAMIC
PK2155
A363
1911

This is a reproduction of a book from the McGill University Library collection.

Title: Maḥākimah-yi markaz-i Urdū.
Author: Aḥmad Dihlavī, Sayyid, 1846-1918
Publisher, year: Dihlī : Shamsī Pres, 1911

The pages were digitized as they were. The original book may have contained pages with poor print. Marks, notations, and other marginalia present in the original volume may also appear. For wider or heavier books, a slight curvature to the text on the inside of pages may be noticeable.

ISBN of reproduction: 978-1-926846-46-0

This reproduction is intended for personal use only, and may not be reproduced, re-published, or re-distributed commercially. For further information on permission regarding the use of this reproduction contact McGill University Library.

McGill University Library
www.mcgill.ca/library

MOONIS BOOK DEPOT
BUDAUN. U. P. (INDIA)

Dihlavi, Sayyid Ahmad

وبہ نستعین

Mahakimah-'i markaz-i Urdu

# محاکمۂ مرکزِ اردو

مُصنّفۂ

منشی سیّد احمد صاحب دہلوی مُولّفِ فرہنگِ آصفیّہ۔ رسومِ دہلی
مناظرۂ تقدیر۔ طبیعی تعلیم۔ فسانۂ رحت۔ انشاء ہادی النساء وغیرہ وغیرہ

جسے

شیخ محمّد اشفاق صاحب دہلوی تاجرِ نامی گرامی کی فرمائش سے نہایت
دلچسپ۔ نیز معلوماتِ جدیدہ و قدیمہ سے پُر حامیانِ زبانِ اُردو کے مُفید
مطلب دیکھکر مینیجر دفترِ فرہنگِ آصفیّہ واقع کوچۂ پنڈت دہلی نے چھپواکر شائع کیا

سنہ ۱۹۱۱ء

شمسی پریس دہلی میں چھپا

(جملہ حقوق محفوظ)

محصول ڈاک

قیمت فی جلد

MOONTS BOOK DEPOT
BUDAUN. U.P. (INDIA).

MG7
D5758m

# اشتہارِ کُتب موجودہ دفتر فرہنگِ آصفیہ دہلی۔ کوچہ پنڈت

**تسخیرِ شوہر** یعنی ساجن موہنی۔ جو ادھر خاوند کو رضامند رکھنے ادھر بیوی کو اپنا فرمان بردار بنا لینے کا نہایت مجرب اور چلتا ہوا تعویذ ہے مع تسخیر اللغاتِ اُردو قیمت حسب سفارش خواجہ حالی مدظلہ العالی ۸ اِس کتاب کو جناب نوّاب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب نے پسند فرماکر مبلغ دو سو روپے کا انعام مرحمت فرمایا۔ اور پبلک بھی نہایت قدر دانی فرما رہی ہے۔

**انشائے ہادی النساء**۔ بہ ترمیم و اضافۂ جدید نظم و نثر ہر دو حصہ۔ اِس میں نہایت شوق انگیز۔ دلچسپ بیگماتی زبان کی خط و کتابت ہر عمر و مرتبے کے لحاظ سے درج ہونے کے علاوہ یہ کتاب بیاہ شادی کی رسموں گیتوں برساتی کیفیت۔ پہیلیوں۔ کہاوتوں۔ کہہ مکریوں۔ بادشاہی باغ کا زمانہ بھونچال کی حقیقت وغیرہ کا دِل پسند مجموعہ ہے ٹکسٹ بک کمیٹی لاہور کی خریدشدہ۔ حکّامِ مدارس و گورنمنٹ کی پسندیدگی کا فخر رکھنے والی اور بار بار طبع ہونے سے مقبول خاص و عام کا پتا دینے والی ہے۔ قیمت مع اضافہ ۱۲ر

**راحت زمانی**۔ یعنی عورتوں کو تضیع اوقات سے بچانے کی ایک انوکھی اور مزیدار کہانی۔ طبع ثالث قیمت عہ

**مہر افروز بیگم کا قصہ**۔ خانہ داری سکھانے۔ خوش سلیقہ بنانے۔ بڑی بوڑھیوں کا پتہ چلا دکھانے۔ اولاد کی تربیت کا ڈھنگ بتانے۔ اور صاحبِ تمیز بنا دینے کا عمدہ لٹکا ہے۔ قیمت فی جلد ۸ر

**کنز الفوائد**۔ یعنی بچوں کے واسطے تقدیر و تدبیر کی مناظرہ آموز بحث۔ تاریخی و عقلی مباحثہ۔ جسپر گورنمنٹ سے دو سو روپے کا انعام ملا تھا اور اب ٹکسٹ بک کمیٹی لاہور نے بھی پسند فرما لیا ہے۔ قیمت ۶ر

**طبعی تعلیم**۔ یعنی بچوں کو کتاب اور اُستاد کے بغیر کھیلوں میں محقق و حکیمانہ مزاج بنا دینے کا کامل نسخہ۔ پسند شدہ ٹکسٹ بک کمیٹی لاہور۔ قیمت ۶ر

**رُسومِ دہلی**۔ بچے کے پیدا ہونے سے۔ بیاہ شادی اور میت تک کی کُل دلچسپ رسمیں جو دہلی میں رائج ہیں مقبول شُدہ ٹکسٹ بک کمیٹی لاہور قیمت فی جلد ۱۲ر

**بزمِ آخر**۔ یعنی شہر دہلی کے دو اخیر بادشاہوں کا طریقِ مُعاشرت جسمیں بطورِ مکالمہ ابو نصر معین الدین **محمد اکبر شاہ** ثانی کے زمانے سے لیکر ابو ظفر سراج الدین **محمد بہادر شاہ** سب سے آخر پادشاہِ دہلی کے عہد تک روزمرہ بیرونی و اندرونی برتاؤ۔ اُنکی عادتیں۔ سیرتیں۔ رسمیں۔ خانگی معاملات۔ خاص خاص واقعات۔ دربار و سواری کے قاعدے جشن و نذروں کے قرینے۔ زنانہ و مردانہ میلوں کے رنگ۔ تماشوں کے ڈھنگ مردوں میں مردوں کی سی بول چال۔ عورتوں میں عورتوں کی سی بات چیت مع تصاویرِ ہر دو پادشاہ و دربار اور سواریٔ جلوس جو پانچ فٹ لمبی ہے درج ہے۔ سر **سیّد احمد خاں** مرحوم نے اپنی کتاب **سیرتِ فریدیہ** میں بھی ایک موقع پر بطورِ سند

(بقیہ بر صفحہ ۴۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مرکزِ اُردو کا مُحاکمہ

بدیں ثبوت کہ

## ہر زبان کا مرکز اُسکی جائے پیدائش ہے

قطعہ

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صُلحِ کُل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
مرکز میں آ پڑی ہے مگر فلسفانہ بحث مقصود اِس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

جس طرح مرکز دائرہ کا وہ وسطی نُقطہ ہی - کہ اُس سے محیط تک جس قدر خط کھینچیں وہ سب آپس میں برابر ہوں - اِسی طرح زبان کا مرکز بھی وہ مقام ہے - جہاں کسی زبان کے ایجاد یا پیدا ہونے کا مہرِ جہانتاب طلوع ہوا ہو - اور اُس سورج کی کرنیں وہاں سے چاروں طرف پھیلی تو ہوں مگر قُربِ مرکز اور بُعدِ مرکز میں وُہی فرق ہو جو ہر ایک چیز کے قُربِ مخرج اور بُعدِ مسافت میں ہوا کرتا ہے +

پس اِس سے ثابت ہے کہ اِن کرنوں کی روشنی مقاماتِ قریبہ میں بعیدہ کی نسبت زیادہ اثر کریگی - یعنی جو اثر مرکز کے قریب ہوگا - وہ بعید میں نہیں ہو سکتا - بلکہ جس قدر فاصلہ ہوتا جائے گا - اُسی قدر اُس کا زور گھٹتا اور مغایرت بڑھتی جائے گی - شُعلہ کی لپٹ یا تیزی جو اُس کے پاس محسوس ہوتی ہے - وہ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہوتی - جوں جوں فاصلہ زیادہ ہوتا جائے گا - اُسکی تیزی کم ہوتی چلی جائے گی - یہاں تک کہ بہت دُور جا کر اُس کا محسوس ہونا بھی قریب قریب معدُوم یا نا معلوم ہو جائے گا اور ہر شخص تمیز کرنے سے مقصر رہیگا یعنی جس طرح وہ روشنی اپنی ہر ایک حد کو مرکز نہیں بنا سکتی - اِسی طرح زبان بھی اپنی اصلی جگہ اور نکاس چھوڑ کر دوسرے مقام کو اپنا مرکز یا مخرج نہیں قائم کر سکتی - ہر ایک ملک کی زبان اپنے ملک اور ہر ایک شہر کی بولی اپنے شہر سے ایک مخصوص خصوصیت رکھتی ہے - مرکز ہمیشہ اپنی خاص جگہ اِس طرح قائم رہتا ہے جس طرح آفتاب اپنے خاص مقام پر قائم ہے اور دیگر سیّارے اُس کے گرد گردش کر رہے ہیں اِسی طرح زبان کا مرکز بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتا +

ہر ایک درخت اپنی جڑ سے شاخوں - ٹہنیوں - پتّوں - پھولوں - پھلوں کو قوت پہنچاتا ہے - نہ کہ شاخیں ٹہنیاں - پتّے - پھول - پھل وغیرہ اُس کی مدد کو آتے یا تقویت بخشتے ہیں - اِس موقع پر مرکز کو منبع یا چشمہ

خیال کرنا چاہیئے اور اُس کے خطوط یا شاعوں کو سوتیں۔ جو چاروں طرف پھیلتی اور ہر قسم کی مٹی۔ جڑی بوٹی اور مختلف معدنیات کا اثر اپنے میں لیتی اور ابتدائی حالت میں فرق ڈالتی چلی جاتی ہیں۔

کوئی سی زبان کیوں نہ ہو۔ اُس کے جاننے اور استعمال کرنے والے **دو قسم** پر منقسم ہیں۔ **ایک** وہ جن کا اصلی وطن جن کا مسقط الراس۔ جن کے باپ دادا اور ننھیال کا وطن وُہی سرزمین او خطہ ہو جس جگہ سے وہ زبان نکلی ہو یہ لوگ **اہلِ زبان** کہلاتے اور اوّل قسم میں شمار ہوتے ہیں۔ **دوسرے** وہ جنہوں نے اُس زبان کو مستند کتابوں سے۔ اساتذہ کے کلام سے صحبت سے۔ اہلِ زبان کے مختلف مضامین اور اخباروں سے حاصل کیا ہو۔ بلکہ قریب قریب خاص محاورات و اصطلاحات کے علاوہ ویسی ہی زبان لکھنے اور بولنے لگے ہوں۔ لیکن اس پر بھی اِن سے غلطی کا ہو جانا ممکن اور واجب التسلیم ہے۔ مگر اہلِ زبان سے ناممکن اور خلافِ قیاس۔ یہ دوسری قسم کے لوگ **زباندان** یا **مُقلّدِ زبان** کہلاتے اور دوسرے درجہ میں گنے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس جگہ کوئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ اُس میں وہاں کی آب و ہوا۔ وہاں کی سرزمین۔ وہاں کے لاحقہ و عارضہ تغیرات۔ طیور و وحُوش پیداوار۔ اشجار و اثمار۔ جمادات و نباتات وغیرہ کا اثر شاملِ حال ہوتا ہے اِسی طرح زبان بھی اِن تعلّقات و عوارضات سے باہر نہیں ہو سکتی۔ یعنی ہر ایک زبان کے بولنے والوں میں ساختِ گلو۔ ساختِ دہن طبیعی جذبات و خواص۔ اندرونی و بیرونی مَلکات و اَصنافِ تاثیرات حسبِ موقع حرکات و سکنات۔ بلکہ سب سے زیادہ لب و لہجہ کا بہت بڑا دخل ہوا کرتا ہے اور یہی باتیں ہیں۔ جن سے غیر ملک یا غیر شہر کا رہنے والا خواہ کیسا ہی کسی زبان کا عالم متبحر و ماہر کامل کیوں نہ ہو جائے۔ ٹھوکر کھائے بغیر نہیں رہتا اور اوّل پہچان اپنی اجنبیت ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسا کہ صاحب قامُوس اور اُس کی بیوی خاتونِ عرب کا معاملہ زبان زدِ خلائق ہے۔ **تذکیر و تانیث** میں وہ لڑکنیاں کھاتا ہے۔ **لب و لہجہ** میں وہ پھسلتا ہے۔ خاص خاص **اشاروں** اور **کنایوں** میں وہ گرتا ہے۔ کسی امر کا **سماں** باندھنے میں وہ گُتّی کھاتا ہے۔ از روئے الفاظ **مقامی** اثر پیدا کر کے دکھانے میں وہ قاصر رہتا ہے۔ **خوشی** کا چربہ وہ نہیں اُتار سکتا۔ ماتم کا پُر درد سین وہ نہیں دکھا سکتا۔ بہادرانہ حرکات و دلیری سپاہیانہ کرتب اور ہتھکنڈے وہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ رزم و بزم کا ہیرو وہ نہیں بنا سکتا۔ عادلانہ عدالت اور ظالمانہ ضلالت کا نقشہ وہ نہیں کھینچ سکتا۔ غرض اسی قسم کی اور سینکڑوں باتیں ہیں کہ وہ ہر جگہ کے اہلِ زبان کا حصّہ اور انہیں کا ورثہ ہیں۔

جن لوگوں میں کسی زبان کا تبحّر یا اُس کا صحیح مذاق نہیں ہوتا اور اس امر کا دعوے کر بیٹھنے کی لاج دامنگیر ہوتی ہے۔ تو وہ ہمیشہ ایسی تدبیریں سوچا کرتے ہیں۔ جن سے اہلِ زبان ہونے کی قید۔ زباندانی کی بیخ ٹکسالی

اور غیر ٹکسالی محاورات کی جانچ ایک سرے سے اُٹھ ہی جائے اور ہم مُصلحِ زبان ہونے کا دعوے کر سکیں۔ اہلِ زبان کے اعتراضات سے بچیں۔ اور جو کچھ ہم قلم اُٹھا کر آزادانہ اناپ شناپ لکھدیں یہ سب کھپتا اور داخل زبان ہوتا چلا جائے۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ جب تک مرکزِ زبان کا چکّر نہ کاٹیں۔ گلی گلی کی خاک نہ چھانیں۔ کُوچہ کُوچہ کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ وہاں کی شریف زادیوں کی گودیوں میں نہ پلیں۔ اُن کی آب و گِل۔ اُن کی گھُٹّی۔ اُنکے خمیر میں وہاں کی طبیعی خصوصیتیں۔ فطرتی اُمنگیں نہ پیدا ہوں۔ اُن کی ماؤں نے۔ اُن کے بزرگوں نے رنج کا۔ خوشی کا۔ خوف کا۔ دلیری کا۔ ہنسی کا۔ گریہ وزاری کا۔ مصیبت و آفت کا۔ روزمرّہ الفاظ اور اُن کے برتاؤ کا۔ اخلاق اور معاشرت وغیرہ کا۔ سبق نہ پڑھایا ہو۔ وہ مرکزِ زبان کے طفلِ مکتب کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ اُن پر یہ مثل صادق آتی ہے۔ کہ سکھائے پُوت دربار نہیں جاتے٭

کیسے ہی بڑے بڑے مُصنّف۔ کیسے ہی اعلےٰ درجہ کے مضمون نگار۔ کیسے ہی عالمِ بے بدل۔ کیسے ہی فاضلِ بے مِثل کیوں نہ ہوں۔ لیکن اِس کوچہ سے نابلد ہی رہیں گے۔ یعنی جب تک عاشقانہ ٹھوکریں نہ کھائیں گے۔ معشوقوں کی نازبرداریاں نہ اُٹھائیں گے۔ ہر فرقہ کے لوگوں کے فقروں میں نہ آئیں گے۔ اُن کی لنترانیاں نہ سُنیں گے۔ اُنہیں کب یہ درجہ مُیسّر ہوگا۔ کہ وہ آسانی سے اہلِ زبان ہونے کا دم مارنے لگیں٭

زبان کی خوبی **محاورات و اصطلاحات** کی خوش اسلوبی **فصیحانہ** بول چال۔ بلیغانہ خاص خاص ضرب الامثال صنائع و بدایع کی واقفیت اور ہر قسم کی صحبت پر موقوف ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں جو لوگ اِس بات کے درپے ہیں کہ اُردو زبان کی یہ مخصوص خوبیاں جاتی رہیں۔ وہ صرف مخرِّبِ زبان ہی نہیں۔ بلکہ زبان کے مزے روزمرّہ کے لُطف۔ مذاقِ سخن تک سے ناواقف اور کسی ایسے کورِدہ کے رہنے والے ہیں جہاں زبان کو زبان ہی نہیں جانتے۔ اُسے صرف ایک عضوِ مُعطّل خواہ گوشت کی بوٹی یا آلۂ اصوات سمجھتے ہیں کجا کہ اُس کے نِکات اور اُسکی باریکیوں سے لذّت آشنا ہونا٭

اِس ضروری تمہید کے بعد اب ہمیں یہ دکھانا منظور ہے کہ دہلی کو کس وجہ سے اُردو زبان کا خاص مرکز۔ خاص ملجا و ماوا۔ خاص ٹکسال گھر۔ خاص ماخذ و مخرج۔ خاص کھیت کہنا چاہیئے۔ تاکہ کھیت کے لکھّے پڑھے بھی اُسے بخوبی سمجھ لیں۔ اور دِل سے مان لیں۔ کہ جب تک اُردو کا لفظ اِس زبان کے ساتھ وابستہ ہے۔ دہلی شاہجہان آباد اُسکی جان کے ساتھ ہمرشتہ ہے۔ ورنہ وہ اُردو نہیں ایک ست بھچڑی زبان ہے۔ علمِ ادب۔ علمِ مجلس۔ انشا پردازی۔ آدابِ شاہی۔ جملہ تصنیف و تالیف۔ تمام علوم و فنون میں کرسی نشینی کا رتبہ اگر ہے تو خاص اِسی اُردو کو حاصل ہے۔ باقی اللہ اللہ خیر سلّا۔

دہلی سے زیادہ کہیں کی زبان شیریں۔ سلیس۔ سہل المخارج۔ عام فہم۔ دِلآویز۔ دِلنشین۔ مؤثر

بے تکلف۔ خارج از آورد۔ لفاظی سے نفور۔ بھرتی کے ثقیل وکرخت یا غیر مانوس الفاظ سے خارج۔ اور مرغوب الطبع نہیں ہے۔ سلاست اِس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور بلاغت میں یہ ایک عجیب لربا ابلا پری ہے۔ اِسکی بلند پروازی آسمان سے ٹکر کھاتی ہے۔ اور اسکی وُسعت فضائے عالم سے بڑھ جاتی ہے۔ سرسید کی دھواں دھار اسپیچیں جو سامعین کا دل ہلا ہلا دیتی اور کبوتر کی طرح لٹا لٹا دیتی ہیں کہاں کی زبان میں تھیں۔ اِسی دہلی کا تصدق تھا۔ خواجہ حالی مدظلہ العالی کی نظمیں جو سنگدلوں کو موم بنا کر بن چھری تڑپاتی اور پھڑکاتی ہیں کس زبان کی رسیلی لاڈلیاں ہیں؟ خیر یہ تو ایک آمدِ سخن بات تھی اِس جملہ معترضہ سے آگے سنئے ؎

دیکھنا یہ ہے کہ دہلی کو اُردو زبان کا مرکز کیوں کہتے ہیں۔ اور دیگر امصار و دیار پر اِس کا اطلاق کیوں روا نہیں رکھتے۔ یہ بات بالاتفاق مانی ہوئی اور تسلیم شدہ ہے کہ اُردو زبان کا اگر مصدر ہے تو دہلی ہے۔ مبدء و مخرج ہے تو دہلی ہے۔ مرکز و ماخذ ہے تو دہلی ہے۔ یہ پیدا کہاں ہوئی؟ دہلی میں۔ اِس نے جنم کہاں لیا؟ دہلی میں۔ اِس کا نعل کہاں گڑا؟ دہلی میں۔ اِس کا خروج یعنی نکاس اور رواج کہاں سے ہوا؟ دہلی سے۔ اِس کی بُنیاد کہاں پڑی؟ دہلی میں۔ اِس کا شاہجہانی اُردو نام کہاں رکھا گیا؟ دہلی میں۔ اِس نے عروج کہاں پایا؟ دہلی میں۔ اِس کا سرپرست اور بانی کون ہوا؟ شاہجہان بادشاہ دہلی و ہندوستان۔ البتہ صاحب قران ثانی سے پیشتر اِس زبان کی نیو رکھنے والے بزرگ تیرھویں عیسوی صدی میں جناب خواجہ ابوالحسن امیر خسرو دہلوی ہیں جنھوں نے دہلی کے سات بادشاہوں کی سلطنتیں دیکھیں اُنکے مصاحب رہے۔ معزز عہدوں کی خدمت بجالائے۔ علاءالدین خلجی کو اپنا ایسا دلدادہ بنایا کہ اُسے آپ کے بغیر ایک لمحہ چین نہ آیا ؎

نظمِ اُردو کے متعلق گو ولی محمد گجراتی کو اِس کا مخترع اور موجد بیان کرتے ہیں۔ مگر اُس نے بھی جو کچھ فیض پایا۔ دہلی میں رہکر پایا اور اسی جگہ اپنے کلام کو ٹکسال باہر کر کے کھرا اور چڑھایا۔ اور اپنے پیر شیخ سعداللہ عرف گلشن شاہ دہلوی کی ہدایت سے دیوانِ اُردو مرتب کیا۔ اگر فارسی آمیز ہندی زبان کے بُنیاد ڈالنے والے حضرت امیر خسرو ہیں۔ تو اِس میں تراش و خراش پیدا کرنے۔ باقاعدہ بنانے۔ ترتیب دینے۔ مروج فرمانے۔ شاہجہانی اُردو نام رکھنے والے۔ شاہجہان بادشاہ ہند ہیں۔ اور یہ دونوں خاص الخاص دہلی سے تعلق رکھنے والے ہیں ؎

اِس بات کو کون نہیں جانتا کہ جہاں سے کوئی زبان نکلتی اور جہاں کا بادشاہ اُس کا سرپرست ہوتا ہے۔ وہیں کی زبان ٹکسالی اور دربار کی کہلاتی ہے۔ گو مرورِ زمانہ کے باعث بعض پُرانے الفاظ و محاورات متروک الاستعمال اور جدید مانوس الاستعمال ہوتے چلے جائیں۔ مگر اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان باتوں سے اُس کا

اصلی سکن اور مرکز بھی بدل جائے یا اُس کی آن وادا اور اندازِ دلفریب میں فرق آجائے۔ دہلی کا روڑا اگر کسی کارخانہ کا بیٹھنے والا یا محنت و مزدوری کرنے والا۔ خواہ ٹوکری ڈھونے والا بھی ہوگا تو ممکن نہیں کہ وہ بے محاورہ بات زبان سے نکال جائے۔ ابھی کا ذکر ہے کہ ایک بڑھیا ماما جاڑے کے مارے سُوسُو کرتی ہوئی بازار سودا لینے جارہی تھی۔ کسی دکاندار نے پوچھا کہ بڑی بی اس طرح کیوں سُکڑتی ہوئی جارہی ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ بھائی! برف کٹ رہی ہے۔ بھلا اس محاورے کو کوئی اور تو بول جائے۔ حالانکہ اس بڑھیا نے کوئی برفانی پہاڑ نہیں دیکھا۔ برف پڑتی ہوئی اُسکی نظر سے نہیں گزری۔ مگر پھر بھی وہ ٹکسالی محاورہ زبان سے نکالا کہ جس سے سردی کی صورت بن گئی۔ کٹنے کے لفظ نے اور بھی جان ڈال دی جس کا لطف اہل زبان ہی خوب لے سکتے ہیں +

دہلی کی گلیوں میں آؤ۔ بازاروں میں پھرو۔ کارخانوں میں گشت لگاؤ۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی ہوا کھاؤ۔ اور دیکھو کہ بازاری آدمیوں کے مُنہ سے بھی کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ انکی گالیوں اور مذاق کو بھی ندرت سے خالی نہیں پاؤگے۔ جہلا اور بازاریوں کی زبان سے کبوتر کو قبوتر سنوگے۔ تپھر کو پھتر گوش زد فرماؤگے۔ فصیل کو صفیل استماع کروگے۔ بلکہ کی بجائے بلکن کی آواز تمہارے کانوں میں پڑے گی۔ علیٰ ہٰذا کدھی بجائے کبھی۔ تعینات بجائے متعین۔ تُکھم بجائے مُبہم۔ جریبانہ بجائے جرمانہ اصغا کروگے۔ مگر اُس کے لوچ۔ اُس کے لہجہ اور تذکیر و تانیث نیز فصیحانہ انداز کے لحاظ سے جان لوگے کہ وہ برمحل اور درست پتا دے رہا ہے۔ گو غلط العام سے گزر کر غلط العوام کالانعام اور تحریری استعمال سے باہر سہی۔ لیکن بول چال میں کوئی عیب نہیں پاؤگے +

ہاں اہل زبان کو یہ بات ضرور ملحوظ رکھنی پڑتی ہے۔ کہ جن الفاظ نے عہدِ حال میں رواج پایا ہے۔ اُن پر بنائے سخن موقوف رکھتے ہیں گو قدمائی کسی اور طرح استعمال کر گئے ہوں۔ مگر انہیں موجودہ طبقہ کے روزمرہ کی طرف رجوع کرنی محاورے کی صحت کے لئے ایک لازمی امر ہے۔ یعنی اس حالت میں بھی اہلِ زبان کو استعمالِ الفاظ وایرادِ محاورات میں اپنے ہی شہر کے محاورے پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ نہ کہ زبانِ اطراف کی طرف رجحان کیا اور قدما کے متروک لاستعمال الفاظ پر دھیان رکھا جائے +

اسی طرح مقلّد کو بھی اہل زبان کے محاورے کی تلاش لازم ہے تاکہ اُس کا سخن قابلِ اعتبار ہو۔ مقلّد سے غیر ملک کا آدمی ہماری مراد نہیں ہے۔ دہلی کے علاوہ ہند کے کسی شہر اور قصبے کا رہنے والا زبان داں کیوں نہ ہو۔ جس حالت میں اہلِ دہلی کی زبان اصل اُردو و مبدءِ فصاحت قرار دیگئی اور یہ شہر زبان کا ٹکسال گھر ٹھیرا۔ تو ہند کے اطراف وجوانب کے باشندے گو وہ۔ لکھنؤ۔ اکبرآباد۔ بنارس

کانپور۔ میرٹھ۔ یا لاہور۔ وغیرہ کے رہنے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ دائرۂ تقلید و احاطۂ تتبّع سے خارج نہیں ہو سکتے۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دہلی شاہجہاں آباد کے سوا دوسرا کوئی سا شہر ٹکسال اور مرکزِ اردو قرار نہیں پا سکتا۔ کیونکہ اُردو لکھنا اور ہے اور اُسکا صحیح لہجہ ادا کرنا اور۔

جس طرح ساکنانِ دہلی۔ اہلِ مشرق و اہلِ پنجاب کے موافق ہائے مخلوط یا ہائے ہوز ایک خاص لہجہ سے ادا نہیں کر سکتے۔ اور اہلِ پنجاب حرفِ قاف کے تلفّظ سے معذور پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح دہلی کے سوا دوسری جگہ کے رہنے والے یہاں کے لب و لہجہ میں انکی برابری نہیں کر سکتے۔ لفظ بھُواں صاحبانِ مشرق بلفظ بھرا باشندگانِ پنجاب جس خوبی سے ادا کریں گے۔ دہلی والے اگر سر پٹک کر مر جائیں گے تو بھی اُن کے حلق سے ادا نہ ہو گا۔

اس میں شُبہ نہیں کہ اہلِ دہلی صرف ایک ہی لفظ سے تغیرِ لہجہ مختلف معانی پیدا کر سکتے ہیں۔ فقط ایک ہاں کے لفظ یا اور کے استعمال کو دیکھئے کس کس موقع پر لہجہ بدلنے سے کیا کیا معنی دیتا ہے علیٰ ہذا القیاس **بھلا۔ بہت اچھّا** وغیرہ۔

اس موقع پر ہمیں چند ایسے شعروں کا لکھ کر دکھا دینا بھی مناسب ہے جو صرف لہجہ سے اپنی خوبی ظاہر کرتے اور ادائے مقاصد کا زوردار کام لیتے ہیں۔ اشعارِ ذیل باوجودیکہ خاص محاورات و اصطلاحات سے پہلو بچائے ہوئے ہیں۔ مگر ان میں اگر حرکات و سکنات اور لہجہ سے کام نہ لیا جائے تو سر تا سر بے لطف اور بے نمک بات ہو جائے۔ یہاں تک کہ کچھ بھی مزا نہ آئے۔ گو عشقیہ مضمون ہیں مگر ایشیائی شاعری جب اسی پر موقوف ہے۔ تو کیا کیا جائے۔ یہ اشعار اُن لوگوں کے ہیں جنہیں زبان پر پورا پورا قابو اور اُس کی حرکات و سکنات پر بدرجۂ اتم عبور حاصل ہے۔ **اشعار**

میں نے ہی؟ بزمِ غیر میں کی شب کو مے کشی
میری ہی؟ آنکھوں میں تو نشہ ہے شراب کا

مسی مل کر تم بغرفہ سے نکالا منہ کرو
اور نہیں گر مانتے تو جاؤ؟ کالا منہ کرو

تم تو میٹھے ہی میٹھے آفت ہوا!
اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہوا!

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

سرو قیمتِ فیج اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق ای خضر
نہ تم! کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو اِدھر بھی

اب تو راضی ہوا کہ ہم جینے سے بیٹھے ہیں خفا
اب تو خوش ہوا کہ تمہارا ہی کہا کرتے ہیں

کیوں دلِ زار محبت کا نتیجا دیکھا؟
دردِ فرقت کا کوئی پوچھنے والا دیکھا؟

ختم

کیا کہیں! خاک کہیں! عشوہ گروں نے مارا
جی بھی اُٹھو کہ یار آتا ہے
ہمدموں کا پُوچھنا ہر دم مِرا دم کھا گیا
رہو گے دِل میں آنکھوں سے نہاں ہو
ہنس ہنس کے کر دتنگ نہ مجھ خاک نشیں کو
پیو بھی! پلاؤ بھی! اِس کا مزا ہے
مزا ہے یہی بات میں بات نکلے
کریں بُت کدہ سے عبث قصدِ کعبہ
رخصت کے وقت ہائے اِس انداز کے نثار
اِدھر ہیں ہم اُدھر محشر میں تو ہو
میخانہ میں کیا لطف ہے کیا آنگ ہے ساقی
میں بھی تو آزمائشِ مہر و وفا کروں
کبھی کی ہو چکی جاں تک بھی نذرِ جانستاں طالب
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اُس کی سیدھی سیدھی باتیں دل میں چُبھتی ہیں بہت
مُنہ سے تو پھوٹ بیدل کیا تو نے جی میں ٹھانی
وہ قہقہے کہاں ہیں وہ وولولے کدھر ہیں
اب سانس کے لینے کی بھی طاقت نہیں باقی
بھلا ہیں اُنکے چکمہ میں کہیں آنے کے قابل ہم
تھا جواب آپ کی شکایت کا
سچ پوچھیئے تو ملنا ممکن نہیں جہاں میں
خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا؟
کیا کہیں باغِ جہاں میں کیا سے کیا کیا ہو گیا
دیکھنا بادِ بہاری کی ذرا اٹھکھیلیاں
میکدہ دُور ہے کتنی اے شیخ

جان کر سیدھا سا بیچارا مسلماں ہم کو
دم یہ خاصا دیا مسیحا نے
کیا کہوں غیں دم نہیں مجھ میں مجھے غم کھا گیا
بھلا؟ سچ کہو! رہو! جاتے کہاں ہو
دیکھو! میں ہلا دونگا۔ ابھی چرخِ بریں کو
یہ مینا رکھا ہے یہ ساغر دھرا ہے
اَدا میں اَدا جب نہ ہو پھر تو کیا ہے
یہاں بھی خدا ہے وہاں بھی خدا ہے
انگڑائی لے کے اُس نے کہا دیکھنا مجھے
جو ہونی ہو خدا کے روبرو ہو
آواز چلی آتی ہے لا اَور پلا اَور
میرا تو امتحان کئی بار ہو چکا
دھرا ہی خاک یہاں لینے جو کچھ اب تک آئی ہی
اِس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
ایسا ویسا تم نہ سمجھو اُس کو بیدل دُور ہے
تیرا اُداس رہنا آفت کی ہے نشانی
روتا ہوں یاد کرکے گزری ہوئی جوانی
بیدل کا بُرا حال ہے اللہ بچائے
اگر اغیار بڈھب ہیں تو یاروں میں بھی بیدل ہم
ورنہ شکوہ ہمارا کام نہیں
دانا بھی آدمی سا نادان بھی بشر سا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا؟
خارِ صحرا گل ہوا اور پھول کانٹا ہو گیا؟
آج بلبل کا چمن میں گُل سے کانٹا ہو گیا
لو آؤ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

کیسی شفا کہاں کی شفا - یہ بھی چند روز
قسمت میں تھا کہ نازِ مسیحا اُٹھایئے؟

عاشق کی دلداری دلبر کیا ہی خدارا کرتے ہو
اِن نیچی نیچی نظروں سے تم کام ہمارا کرتے ہو

کہاں تک رازِ عشق افشا نہ کرتا ٭
مُشکل ہے یہ کہ مرتا کیا نہ کرتا ٭ ٭

اگر مینا کی گردن خم نہ ہوتی ٭
تو کیا ساقی کو میں سیدھا نہ کرتا ٭

اس عاشقِ غریب کو گروہ ستائیں گے
پہنچیں گے کس فلاح کو کیا فیض پائیں گے

ارادہ گدگدی کا اور نہ قصد بوسہ یاں دل میں
بھلا تم بیٹھے بیٹھے بے تکلف کیوں سنبھل بیٹھے

زاہد تجھے قسم ہے خدا کی اِدھر تو آ
کیا نور سا جھلکتا ہے شیشہ کے جام میں

بُت ہی بنکر آن بیٹھیں گے بلا تو تو ہیں
کاٹ لینا تم زباں گر لب ہلائیں سامنے

ہمکو آرام ہو چکا ناصح
آپ کی بات اور طبیب کی بات ٭

یاں تلک آکے پھر اُلٹا تمہیں جانا کیا تھا
کیا زمیں ماپنے آئے تھے یہ آنا کیا تھا ٭

یہ کبھی ہونی نہیں میں تمہیں سونے دوں آج
لاکھ اب آپ لیا کیجے انگڑائیاں ٭

ڈبا دیا مجھے اس چشمِ تر کو کیا کوسوں
جلا دیا مجھے سوزِ جگر کو کیا کوسوں ٭

لو ہم ہی اس جہان سے رُوپوش ہو چلے
نہ کر رکھو اب آپ اس اپنے حجاب کو

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اُٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نہ رو کو مجھ کو یہ کہہ کر کہ ہا! سنو تو سہی
وصال میں ہے ستم یہ ادا سنو تو سہی

چلو بس حضرت عیسیٰ تم اپنا کام کرو ٭
مریضِ عشق کو ہوگی شفا؟ سنو تو سہی ٭

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

دل کھو کے مل چکے جو میرے ملنا ہے
آنکھیں بھی دکھاتے ہو پھر منہ بھی چھپاتے ہو

کچھ بات راز کی ہے ذرا کان لایئے؟
ہے جی میں آج خوب عدو کو بنایئے

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

نکر برباد عمرِ بے بہا کی ایک ساعت بھی
کہ یہ جنسِ گراں مایہ کہیں جا کر بھی آتی ہے

غرض جن وجوہ سے اہلِ زبان کو اپنے ہاں کے طبقہ موجودہ کے روزمرّوں اور محاوروں کی تقلید سے گریز لازم نہیں اسی طرح مقلدِ زبان پر بھی یہ فرض نہیں کہ وہ پُرانی لکیر کا فقیر بنکر زبانِ قدما کی پیروی عیارِ سخن اور میزانِ زبان قرار دے ٭

ہم دیکھتے ہیں جس طرح دہلی کو مرکزِ اردو سے حرفِ غلط کی طرح اُڑایا جاتا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ پر بھی

آیا جاتا ہے۔ گو اہلِ دہلی لکھنؤ کو بھی اس وجہ سے مرکزِ اُردو نہ مانیں کہ اودھ میں دہلی ہی کے اہلِ زبان یہاں کے قدر دانوں کے مِٹ جانے کے سبب وہاں جاکر رہے اور اُنھوں نے اسی اُجڑے دیار یعنی دہلی کے محاورات و صطلاحات کو وہاں بھی اپنے روزمرّہ برتاؤ اور بول چال میں برقرار رکھّا۔ چنانچہ ایک موقع پر سید محمد تقی میر نے خود فرمایا ہے۔ **قطعہ**

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

ایک دفعہ حضرت غالب سے ناسخ کی بابت پوچھا تو آپ نے بھی طنزاً یہ جواب دیا۔ ؎

زبانِ میر اور مرزا کہاں ہے ✦ مگر ہاں پُربیوں میں خوش بیاں ہے

اس کے علاوہ جو خاندان شاہانِ اودھ کے مورثِ اعلیٰ کے ساتھ دہلی سے بگڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہ بھی اکثر دہلی کے امراو شرفا کے خاندان تھے۔ جن کی آل اولاد آصف الدولہ کے عہد سے لیکر سعادت علی خاں کے زمانہ تک تمام دربار پر حاوی و مسلط رہی۔ اسی وجہ سے اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں اُنہیں کی زبان جاری ہوئی۔ یہاں تک کہ شعرائے دہلی بھی نوابانِ لکھنؤ کی قدر دانی کے باعث اُسی طرف جھک پڑے۔ اِدھر **مرزا رفیع السودا** اپنے بلیغ اشعار کا گراں مایہ سودا لے کر وہاں پہنچے۔ اُدھر **سیّد محمد تقی میر** اپنی فصاحت کا ڈنکا بجاتے ہوئے درآمد ہوئے۔ اخیر میں میر غلام حسن متخلّص بہ حسن خلفِ میر غلام حسین ضاحک نے آسمانِ لکھنؤ میں بدرِ کمال اور ماہ منیر بن کر چھیت کیا۔ جب تک اِن لوگوں کا دور دورا اور دم کا دامہ رہا۔ انھوں نے اپنی زبان کو مشرقی زبان کے اختلاط سے برابر بچائے رکھّا۔ مگر پھر جو زمانہ نے پلٹی کھائی تو وہاں کی وہ زبان جو خاص خاص لوگوں میں مروّج تھی۔ پوربی بھاکا آمیز اُردو بن گئی۔ یہاں تک کہ نامی شعرائے لکھنؤ بھی اس سے نہ بچ سکے۔ کچھ نہ کچھ اثر آ ہی گیا۔ بلکہ محاورات کے علاوہ وہاں کے لب و لہجہ نے بھی وہی طرز اختیار کر لی۔ جس سے اہلِ دہلی کے کان نہ جب آشنا تھے اور نہ اب آشنا ہیں۔ لکھنؤ کے صرف عوام نے ہی اس پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ خواص بھی خالی نہ رہے۔ اکثر **تذکیر و تانیث** کے فرق سے لیکر محاورات میں بھی بہت کچھ بل پڑ گیا۔ چنانچہ ہم تمثیلاً نہایت اختصار کے ساتھ چند باتیں بلا ترتیب معرضِ تحریر میں لاتے ہیں۔ دونوں جگہ کے اہلِ زبان نظرِ انصاف سے ملاحظہ فرمائیں۔ کہ یہ فرق جو پایا جاتا ہے کیا اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ ہر حالت میں دہلی کے سوا دوسرا مقام اُردو کا مرکز ہوا ہے نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب میر انیس مرحوم فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے آبا و اجداد خاک پاکِ دہلی سے تھے۔ اب چند تمثیلیں ملاحظہ فرمائیے

مثلاً ساونی گانا۔ ساونی پھولنا اہل دہلی کبھی نہیں بولتے مگر حضرت امیر مینائی اور جناب احمد علی صاحب شوق وغیرہ کے کلام میں موجود ہے۔ امیر ؎

جب چمن میں آگیا مستوں کو ساون کا خیال — ساونی گاتی ہوئی آئی گھٹا برسات کی

اور بھی لگائی آگ ساونی نے پھول کر — پیڑ پر میری نظر پھر پڑی نہ بھول کر

پاما بجائے لینا یا چھل کرنا دہلی والے کبھی نہیں بولتے مگر امیر صاحب و حضرتِ شوق نے باندھا ہے۔

ملاحظہ ہو امیر ؎

"ہاتھ ہے کوتہ شاخ ہے اُونچی پائیں گے کیونکر کوئی ثمر ہم"

پاکے تمہارے خط کو آج - دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور — دل میں بھڑک کے غم کی آگ جسم پہ تپ چڑھی کچھ اور

یا قدم رکھتی نہیں تُو آنسوؤں کو۔ پاسکے شور + — یا قدم جمتے نہیں غالب ہے تجھ پر اُن کا زور +

لاکھ بٹ جائے خیال۔ آئے جو تو۔ چین آہی جائے — شوق کو بھی یہ تمنّا ہے کہ تجھ کو پاہی جائے

بولا چاہتی ہے - خاص پوربی اور کھڑی بول چال ہے۔ مگر حضرتِ امیر نے اِسے بھی داخل فصاحت فرمایا ہے ؎

خوشا مد اے دلِ بیتاب اِس تصویر کی کب تک — یہ بولا چاہتی ہے پر نہ بولے گی نہ بولی ہے +

نشہ ہرن کرنا ؎

بڑھاپے نے ہرن سب کردئے نشّے جوانی کے

علیٰ ہذا لفظ جان جلایئے ؎

کیا ہے ہمارے دل میں بھلا جان جایئے +

چکھّا چاہیئے ؎

ترکِ لذّت بھی نہیں لذّت سے کم — کچھ مزہ اِس کا بھی چکھّا چاہیئے +

چاٹ دینا ؎

وہ چاٹ دوں کرے نہ مذمّت شراب کی

پیراک ؎

دست و پا کتنے ہی پیراکوں نے مارے رہ گئے

ارے توبہ - احمد علی شوق ؎

ارے توبہ ستاروں پر ہوئے کیا کیا گماں دیکھو

تیلوری سے آپڑا باشا تلوری پر وہ گندے جوڑ کر + کیا میں غل کردوں کہ یہ اڑ جائے اسکو چھو کر

تِتلی ـ سے ـ تیلیوں کے رنگ دیکھو کس قدر دلچسپ ہیں +

سر پھرنا ملاحظہ ہو ـ سے

تُو نے رخ جدھر کیا دل کا رُخ اُدھر پھرا ــــ تو پھر اجو یاس سے دل بھر آیا سر پھرا

پینگ آنا جانا ـ سے ـ پینگ آئیں جائیں گے اور ہلیگا دل مرا +

پلنگ پر رہنا ـ سے

وہ پلنگ انہیں کا ہے اُسپہ اب ہے تو کون ــــ خود آکے وہ رہیں جاکے یہ کہے تو کون +

چہرے کا رنگ کٹنا ـ سے

ضعف سے جسم لٹ چلا ـ روح بدن سے ہٹ چلی ــــ چہرے کا رنگ کٹ چلا ـ نبض کی چال گھٹ چلی

کرم ـ کی لفظی رعایت سے

تم سے ـ مرے نصیب ـ میں ـ شاید ابھی کرم نہیں ــــ وہ ہیں بڑے ہی خوش نصیب ہجر کا جنکو غم نہیں

اسی طرح ـ شعریں ـ برسیں ـ چپتیں ـ سانسیں ـ چھان بنان بجائے چھان بین ـ کنتھی بجائے کنجلک یا گلجھٹی ـ بھل بجائے بل ـ پلا بجائے پلڑا ـ بھنگی آنکھ بجائے بھینگی آنکھ ـ گواہی دینا ہوگی ـ لوٹ چلو ـ پلٹ چلو بجائے پھر چلو ـ میں اُنکے یہاں گیا تھا ـ وہ میرے کے یہاں آئے تھے بجائے ہاں + (سکت ـ آنکھ مچولا ـ دھاگا ـ چپت ـ طوطی ـ دریا ـ ہاتھی وغیرہ بحالتِ تانیث) + (مالا ـ موتیا ـ فہم ـ ہتھنی وغیرہ بحالتِ تذکیر) + امیر سے ـ کب زاہدوں کو مسئلہ عشق کا ہے فہم) اے صاحب ـ ارے لو صاحب لے اب جائیے سے اب جانے دیجئے ـ تمسک لکھ گیا ـ روپیہ کھو گیا بجائے کھویا گیا ـ ابھی ابھی ـ سانسیں ـ سلّی بجائے پتھری ـ چُچّی بمعنی بوسہ نیز مچھلی ـ لے اب ہماری بھی سنو ـ جھوٹھا ـ اندھیر بجائے اندھیاؤ ـ سارے دن بجائے تمام دن وغیرہ وغیرہ

اس موقع پر ہمیں دو لطیفے یاد آگئے ـ پہلا لطیفہ ـ اُستاد ذوق کے پاس ایک مرتبہ اُنکے ایک لکھنوی دوست شیخ ناسخ کی ایک تازہ غزل سنانے آئے جس کے تین شعر یہ ہیں ـ اشعار ـ

کوئی غنچہ ہے کوئی گل ہے کوئی پژمردہ ہے ــــ دیکھتے ہیں ہم تماشا گلشنِ ایجاد کا

عاشقِ جانباز کا ضائع نہیں جاتا ہے خوں ــــ خسرو و شیریں سے پوچھو ماجرا فرہاد کا

باغ سے وحشت ہوئی یادِ قدِ دلدار میں ــــ دیو کا سایہ ہوا سایہ مجھے شمشاد کا +

مگر اُستاد ذوق کے پاس یہ غزل پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور وہ اُس پر غزل بھی لکھ چکے تھے چنانچہ جھٹ اندر اُٹھکر گئے اور وہ غزل لاکر سنانے بیٹھ گئے جس کے تین شعر یہ ہیں

**اشعار**

غل مچایا قمریوں نے ہے مبارک باد کا سرو عاشق ہوگیا اُس غیرتِ شمشاد کا

خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیّاد کا ہے قفس سے شور ایک گلشن تلک فریاد کا

کوہ کے چشموں سے ہوتا خوں رواں فرہاد کا کچھ گدازِ عشق میں ہوتا اثر تو دیکھتے

دوسرا شعر سنتے ہی چونکے اور فرمایا کہ ہیں؟ آپ نے طوطی کو مذکر باندھ دیا۔ حالانکہ اِس میں یائے معروف علامتِ تانیث موجود ہے کل کو آپ جوتی کو بھی احاطۂ تذکیر میں لے آئیں گے۔ اُستاد ذوق نے فرمایا کہ حضرت محاورے پر کسی کے باپ کا اجارہ نہیں ہے۔ آج آپ میرے ساتھ چوک پر چلئے اور اکبر آبادکی یہ ضرب المثل کہ ”وہ چڑیمار ٹولا بھانت بھانت کا جانور بولا،، آزمائیے۔ دیکھئے کہاں کہاں کے پکھیرو جمع ہوتے اور کیا کیا ہانک لگاتے ہیں۔ وہ اِس بات پر راضی ہوگئے۔ جب شام کا وقت ہوا دونوں صاحب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جہاں گُدڑی لگتی ہے پہنچے۔ دیکھا۔ کوئی قسم قسم کے کبوتروں کا پنجرا بھرے بیٹھا ہے۔ کسی کے پنجرے میں لال ہیں۔ کسی کے بئے۔ کوئی اصیل مرغ کی گردن پر ہاتھ پھیر پھیر کر دکھا رہا ہے۔ کوئی مینا۔ کوئی اگن۔ کوئی بٹیر۔ کوئی تیتر لئے ہوئے ٹہل رہا ہے۔ ایک شہدے صاحب بھی ہاتھ میں طوطی کا پنجرہ اُٹھائے دُنتر خم دکھاتے چلے آتے ہیں۔ اُستاد ذوق نے اشارہ کیا۔ ذرا اِن سے بھی دریافت کریجئے۔ آپ نے بے تکلف پوچھا کہ ”وہ بھیا تمہاری طوطی کیسی بولتی ہے؟،، بھلا۔ شہدے سے ایسے موقع پر کب رہا جاتا ہی جواب دیا کہ میاں بولتی تمہاری ہوگی یاروں کا طوطی تو خوب بولتا ہے،،۔ یہ غریب بہت خفیف ہوئے اور اپنا سا مُنہ لیکر رہ گئے۔ اُستاد ذوق نے کہا کہ حضرت اِس بات پر نہ جائیے کہ شہدوں کی زبان ہے۔ یہی دہلی کے خاص وخواص کی منطق ہے۔ جس موقع پر یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔ اُس کے لئے مذکر بولنا اور بھی باعث لطف ہوگیا۔ دوسرا لطیفہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا ذکر ہے کہ اِسی طرح ایک دفعہ کسی رئیس لکھنؤ وارد دہلی اور میرزا قربان علی بیگ **سالک** شاگرد رشید حضرت **غالب** سے بعض الفاظ کی کراہت۔ ثقالت اور لطافت کی چھیڑ ہوئی رئیس لکھنؤ نے بروقتِ ملاقات حضرتِ سالک سے ارشاد کیا کہ حضرت آپکے دلّی والے الفاظِ کریہ بولنے سے درگزر نہیں کرتے اور اُنہیں عین فصاحت سمجھ کر شربت کا سا گھونٹ پی جاتے ہیں میرزا سالک نے فرمایا بھئی وہ کون سے لفظ ہیں جنکی طرف آپ کا اشارہ ہے ذرا میں بھی تو سنوں اگر در حقیقت کریہ الصوت اور کریہ المعنی ہیں تو میں بھی اُن سے اجتناب کرونگا رئیس صاحب نے فرمایا دور کیوں جائیے ذرا کیچڑ ہی کے لفظ کو ملاحظہ فرمائیے۔ رائے ثقیلہ کا

۵ جناب نواب احمد سعید خاں صاحب جاگیردار لوہارو فرماتے ہیں ؎ طالب غزل سرا ہے تو کہتے ہیں اہلِ بزم ؎ طوطی چہک رہا ہے کسی شاخسار پر۔

کیسا کریہ اور ثقیل لفظ اُنکی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ حضرت سالک نے پوچھا آپ کے نزدیک اِس لفظ کے بجائے کونسا فصیح اور موزوں لفظ ہے۔ کہنے لگے ارے حضرت کیچ بروزنِ پیچ۔ دیکھئے کیسا چھوٹا سا اور سلیس لفظ ہے اور ہمارے کے یہاں یہی بولا جاتا ہے۔ حضرت سالک مسکرائے اور ذرا ستم ظریفی کو کام میں لاکر فرمایا۔ کہ میری رائے میں بھی ایسی رائے ثقیلہ کو کُل الفاظ سے نکال ڈالنا چاہیئے لیکن ذرا اتنا اور بتا دیجئے کہ آپ کے ہاں سُرین کے معنے میں کس لفظ کا استعمال ہے۔ کیا آپ اسکی رائے ثقیلہ کو بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں یہ فقرہ سُنتے ہی ایسے لئے گئے کہ مُنہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور یہی کہتے بنی کہ درحقیقت ہمارے کے یہاں بھی یہی رائے مثقلہ بعض الفاظ میں اِس قدر مستعمل ہے کہ جن الفاظ کو دہلی میں رائے مُہملہ سے بولتے ہیں ہم اُنہیں رائے ثقیلہ سے استعمال کرتے ہیں گو یہ استعمال یہاں والوں کے کانوں کو اچھا معلوم نہ دے مگر حسبطرف جمِ غفیر ہو اُسی طرف یہ فقیر نام کا امیر بھی ہے۔ مثلاً مچھّڑ۔ کنکڑ۔ وغیرہ بہ رائے ثقیلہ ہم جائز رکھتے اور فصیح سمجھتے ہیں۔ لیکن دھی برے۔ پکوڑے۔ پکوڑیاں وغیرہ بہ رائے مُہملہ ناجائز اور خلاف فصاحت جانتے ہیں گو آپ کے یہاں بہ رائے ثقیلہ اچّھا خیال کرتے ہیں چلو ہم دونوں برابر رہے اور اب کسی کو بھی کسی پر اعتراض کی گنجائش نہیں رہی مرزا سالک نے فرمایا خیر یہی غنیمت ہے کہ آپکی اُڑ تو ٹوٹی کہ آپ نے دہلی اور لکھنؤ کو مساوات کا درجہ بخشدیا ورنہ صاحبانِ لکھنؤ تو دہلی کی زبان کو زبان ہی نہیں مانتے۔ جس روز یہ لطیفہ ہوا اُسکے دوسرے ہی دن منشی بہاری لال مشتاق نے اکمل الاخبار میں یہ ساری کیفیت مع نام درج کرکے گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں اِس مناظرہ کی شہرت کردی۔ اکثر لوگ اِس لطیفہ کو حضرت غالبؔ کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن یہ غلط ہے کیونکہ اُنکا انتقال ۶۹ء میں ہو چکا تھا اور یہ اُسکے پانچ چھ سال بعد کا ذکر ہے چنانچہ اِس امر کی دہلی کے ایک مُستند رئیس قرابت دارِ حضرت غالب سے بھی تصدیق ہوئی وہ فرماتے ہیں کہ مجھے خوب یاد ہے اِسی زمانہ میں میری شادی ہوئی تھی اور اکمل الاخبار نے اِسکا خوب خاکہ اُڑایا تھا +

اِس میں شبہ نہیں۔ کہ اہل لکھنؤ غیر مانوس۔ غیر متعارف۔ دقیق اور بے میل الفاظ کو مستعمل کر لینا ترقیِ زبان کا باعث خیال فرماتے اور آورد کو داخل حسنات سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اِسی وجہ سے جو لوگ زبان کی خوبیوں سے واقف ہیں اُنکا دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ لکھنؤ کی زبان آورد کے بغیر نہیں بولی جاتی۔ قافیہ پیمائی اور جگت بازی اُس کی جان ہے۔ لفظی رعایت اُس کا دین و ایمان

دہلی کی زبان تکلّف سے دور۔ تصنّع سے نفور۔ تکلفات سے مُنزّہ اور نہایت شُستہ ہے۔

اگر دہلی زبان کے حق میں شیراز ہے تو لکھنؤ اصفہان۔ جس طرح شیراز شاہانِ ایران اور زبان فصیح کا سب سے پہلا اور قدیم دارالسلطنت ہے۔ اِسی طرح اصفہان اُس کے بعد طہران سب سے اخیر وقت کا

کا دار الخلافہ ہے۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ زبانِ لکھنؤ میں غیر مانوس اور بے میل الفاظ کی بھرتی ہے اب ہم کہتے ہیں کہ بے جوڑ الفاظ کی آمیزش سے بھی لکھنؤ کو کبھی انکار نہیں ہوا۔ چند الفاظ بطورِ نمونہ ملاحظہ فرمایئے اور یہ سمجھ لیجئے کہ ہم نظیراً پیش کرتے ہیں نہ کہ اعتراضاً۔ ورنہ ؎

جو رو کر ابر کو دریا بہا دینے کا دعوےٰ ہے ۔ تو ہم کو اپنے رونے پر رُلا دینے کا دعوےٰ ہے

ہوا بمعنی خواہش۔ جناب احمد علی شوق ؎

گرد جنگل بیچ جنگل میں فضا ہے باغ کی + دیکھ لیں جنگل کو پھر دل کو ہوا ہے باغ کی

گرم خو۔ بجائے تند خو۔ امیر ؎ خدا ہی باندھے ہوا کچھ ایسی کہ دل ہو اُس گرم خو کا پانی +

ہاتھ فگار کرنا بجائے ہاتھ زخمی کرنا۔ امیر ؎ ہاتھ گلچین کے کیئے باغ میں کانٹوں نے فگار +

علیٰ ہذا۔ آنسو پاک کرنا۔ آنسو جوش پر آنا۔ آنکھ اُٹھنے آنا۔ بلی نانگھنا۔ آتشک نکلنا۔ آشنائی کھٹ کرنا آگ اُبلنا۔ اکھلاپن۔ آمد آمد پھیلنا۔ چشم بہنا۔ آنکھیں پڑپڑ کرنا۔ تمہاری قضا پھڑ پھڑا رہی ہے۔ تلوار کچاکچ چلنے لگی۔ آنکھیں اگلنا۔ آنکھوں پاؤں بہنے۔ آنکھوں کے آگے پاؤں۔ کسی کے قدم بقدم چلنے کے بجائے پاؤں پر چلنا جیسا کہ حال میں ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "معہ خدا اُمت کے دل میں بھی ایسا ہی اثر ڈالے کہ اُس فدائے قوم کے پاؤں پر چلے"، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح پوربی الفاظ نظم نثر میں مخلوط و آمیز ہوئے ہیں۔ جو اوپر ظاہر کر دئے گئے ہیں۔ پس انہیں وجوہ سے ہم لکھنؤ کو خاص اُردو یا ٹھیٹ اُردو کا مرکز یا ماخذ نہیں کہہ سکتے ورنہ باعتبارِ تصانیف و علمِ عروض وغیرہ اُس نے خاصی ترقی کی ہے۔

لکھنؤ کی بحث تو ختم ہوئی اگر اُس کو اردو کا مرکز نہ مانا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔ اب لاہور کی طرف توجہ فرمایئے۔ یہ بات کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ زندہ دلانِ پنجاب نے بلحاظِ ترقی مُردہ دلانِ دہلی کو پرے بٹھا دیا ہے اور انکو پست ہمتی سستی۔ کاہلی بے علمی۔ باوجودِ افلاس لنترانی نے رہا سہا کھو دیا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ وہ سرشتی اثر اور اپنی مادری زبان کو کھو بیٹھے۔ یہاں کی آب و ہوا اور فطرتی مناسبت کو رو بیٹھے۔ ہاں اگر یہاں کی سرزمین۔ یہاں کی آب و ہوا۔ یہاں کے گلی کوچے۔ یہاں کی سی صفائی گلو۔ حسبِ مخرج ادائے الفاظ کی قوت اُٹھ کر لاہور چلی جائے۔ تو اُس کا زبانِ اُردو کے واسطے مرکز قرار دے لینا کچھ قابلِ اعتراض نہیں مگر جس حالت میں لکھنؤ مرکز ثابت نہ ہو سکا اور اُس کی قدامت نے بھی مرکز نہ بننے دیا تو لاہور کی تو وہی مثل ہے کہ آمدی کے پیر شدی۔ اس میں اُردو کے رواج کو کے دن کے راتیں ہوئیں۔ سب سے پہلے منشی ہرسکھ رائے صاحب نے جن کے ہاں منشی نول کشور جیسے اولوالعزم

اور لائق کارکن تھے غدر سے آٹھ نو برس پہلے بروقتِ الحاقِ پنجاب ۱۸۴۹ء میں اخبار کوہ نور بزبانِ اردو نکالا - اور وہ شمالی ہند کی نسبت ہمارے ہاں زیادہ خریدا گیا - ۱۸۵۶ء میں محکمۂ تعلیم قائم ہوا - مگر بعد از فتحِ دہلی جب لاہور پنجاب کا دار الخلافہ قرار پایا - اور دہلی اُس میں شامل ہو کر ۱۸۶۴ء میں لاہور گورنمنٹ کالج کی ۱۸۶۶ء میں لاہور مشن کالج کی وہاں بنیاد پڑی ۱۸۷۷ء میں دہلی کالج اُجڑا - اور ڈاکٹر لیٹنر صاحب کی کوشش سے ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی با اختیار ہوئی تو ہر ایک محکمہ میں اُردو کا تسلط زیادہ ہونے لگا -

پنجابی اخبار ۱۸۶۳ء میں نکلا - منشی محمد عظیم اور اُنکی لائق اولاد نے زبانِ دہلی کا چسکہ ڈالنا شروع کر دیا - اِسکے دو برس بعد یعنی ۱۸۶۵ء میں اخبار انجمن پنجاب کا دور دورا ہوا - اِسکے مضامین کی نفاست - زبان کی سلاست تصانیف پر معقول تقریظوں وغیرہ نے تمام پنجاب کو ایک دفعہ ہی اُردو زبان کا فریفتہ اور شیفتہ بنا دیا - مولوی محمد حسین آزاد - منشی سید محمد لطیف جیسے اڈیٹروں نے چار چاند لگا دئے - اخیر میں مولوی سیف الحق ادیب اور میر نثار علی شہرت نے بھی زبان کی ترقی میں کچھ کسر نہ رکھی - انجمن پنجاب کے مشاعروں نے ڈاکٹر لیٹنر کی صدر مجلسی نے نیچری نظم کا شوق ڈالا - مولوی محمد حسین صاحب آزاد - خواجہ حالی مظلہ العالی - خواجہ ضیاء الدین - مرزا ارشد - سیف الحق ادیب - میر نثار علی شہرت وغیرہ نے اشعار کا ولولہ پیدا کیا [illegible] میں سررشتۂ تعلیم سے رسالۂ اتالیقِ پنجاب سررشتہ تعلیم کے سرکاری اخبار نامی کے بجائے جو رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب کی اڈیٹری اور حضرت آزاد کی سب اڈیٹری سے نکلتا تھا جاری ہوا - اور اکثر اُردو کے قابلِ قدر اخبارات جیسے رفیق ہند - رہبرِ ہند - شفیق ہند - اخبارِ عام وغیرہ نے ظہور پکڑا - دہلی کے خانہ خراب مضمون نگاروں کی بھی روزی نکل آئی کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر نے ڈائرکٹری کا چارج لیتے ہی دہلی کے اہلِ کمال کو نہایت اعزاز سے وہاں بُلا لیا اور سررشتہ تعلیم کی اُردو تصانیف کو ایسا مانجھا کہ دہلی کی اصلی اور ٹکسالی زبان کا لطف آگیا - البتہ اِن کے بعد سائم صاحب کے زمانہ میں جس قدر جدید تصانیف ہوئی وہ بلحاظِ زبان قابلِ اعتراض ہیں اور ابھی تک یہ نقص باقی ہے جس طرح شاہی زمانہ میں دہلی کے باکمال و اہل خاندان لکھنؤ چلے گئے تھے - اِسی طرح غدر کے بعد تلاشِ روزگار دہلی کے اکثر اہلِ زبان پنجاب میں اور زیادہ تر خاص لاہور میں دار الصدر ہو جانے کے باعث عارِیتاً جا بسے تھے - اِنکے دم سے اردو کا زیادہ رواج ہوا - اخباروں کی اڈیٹری اِن لوگوں نے کی نامہ نگار یہ بنے - کاتب یہ بنے - ناولوں کی زبان اِن لوگوں نے درست کی - اور ہر طرح سے لاہور کی اُردو کو عیوب سے پاک کیا - چونکہ اہلِ پنجاب میں مادۂ ماخذ خدادا دہے انھوں نے اِس طرف توجہ کرتے ہی صاف و شستہ اُردو لکھنی شروع کر دی لیکن خاص خاص محاورات و اصطلاحات

اور علی الخصوص لب و لہجہ میں بُعدِ مسافت و فرقِ سکونت کے باعث بازی نہ لے سکے - جس کی وجہ سے ہم لاہور کو مرکز اردو کہنے میں متامّل ہیں - البتہ اگر حیدرآباد دکن کی نسبت یہ خیال کیا جاتا تو وہ ایک حد تک درست اور بجا تھا - کیونکہ اوّل تو دہلی کے مُغلیہ خاندان کے ساتھ یہاں کے شُرفا و نُجبا - اہلِ زبان ارکینِ سلطنت وہاں جا بسے تھے - عالمگیر نے مرتے دم تک دکن نہ چھوڑا - اُسکی فوج اُسکے سپاہ سالار - اُس کے وزرا - اُمرا اُس کے دم کے ساتھ رہے - چنانچہ اب تک وہاں کی مستورات میں دہلی کے ٹھیٹ محاورے دہلی کے رسم و رواج - عورتوں کے قدیمی عقائد موجود پائے جاتے ہیں اور مرد تو دہلی الاصل تھے ہی - اس کے علاوہ وہاں کے بادشاہ نے خدا اُسے سلامت رکھے اُردو کی وہ سرپرستی اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی حامئ اُردو اُس سے لگا نہیں کھا سکتا اُردو کی گرتی ہوئی زبان کو اُس نے سنبھالا - قدیم و جدید محاوراتِ زبان کا مخزن اُس نے جمع کرا دیا - ہر ایک علم و فن کی تصنیف کا ذخیرہ اُس نے لگا دیا - بڑے بڑے اہلِ کمالوں کو فراہم کر لیا - گویا ڈوبتی ہوئی ناؤ کو اُبھار لیا - اُردو کے شعرا کا وہاں جمگھٹا ہے - اردو کے انشا پردازوں کا وہاں ہجوم ہے - اہلِ زبان وہاں جمع ہیں اُمیدوارِ زبان وہاں - اسکے ماسوا سلطان دکن خلد اللہ ملکہ نے خود بھی اُردو نظم کی طرف توجہ فرمائی - کلام الملوک ملوک الکلام کی زندہ مثال دکھائی - سررشتۂ تعلیم و دفاتر میں اسی کو شاہی زبان ٹھہرا کر جگہ دی - اُردو اخبارات اور رسالوں کی خریداری سے امداد فرمائی - مُصنفوں کو وظائف انعام و اکرام دے دے کر اُنکی محنت کی داد دی اور بار احتیاج سے مستغنی فرما کر اظہار خیالات و ترقّیِ زبان و علوم و فنون کا موقع دیا - نہ کہ جس طرح بعض مقامی گورنمنٹوں اور اُردو کی مخالف ریاستوں نے تعصّب کو کام فرما کر اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکدیا یا پھینک رہی ہیں - اس سلطنت نے بھی ایسا ہی کیا ہو - دکن کے خمیر میں چھ سو برس سے پہلے سلطان محمد عرف الغ خان نے دلّی شہر کو اُجاڑ کر یہاں کی خُو بُو - عادت و خصلت کا وہاں ڈھیر ڈال دیا تھا مگر اُردو زبان کے پیدا ہوتے ہی رؤسا دکن نے اسکے قالب میں ایک تازہ روح پھونک دی اگرچہ اُردو شاعری کا چرچا اب سے ۸۲ - ۸۵ برس پیشتر عالی جناب نواب سکندر جاہ بہادر و نواب فلک انتساب ناصر الدولہ بہادر کے عہد میں جو تقریباً ۱۲۴۴-۱۲۴۵ہجری کا زمانہ ہے - راجہ راجایاں مہاراجہ چندو لال صاحب مدار المہام ریاست حیدرآباد کے دم سے خوب زوروں پر رہا - بلکہ علمِ ادب علمِ تصوف علمِ تاریخ - علمِ اخلاق پر بھی دیوان صاحب کی نہایت توجہ رہی جس کے سبب سے دہلی کے نامی شعرا میں سے شاہ نصیر شیخ وزیر علی مسرت - وجیہ الدین منیر - اور انکے بعد دیگر شعرا بھی پہنچے - حتیٰ کہ اُستاد ذوق سے بھی یہ ذکر ایک مقطع میں لائے بغیر نہ رہا گیا چنانچہ فرماتے ہیں - ع

گرچہ ہے مُلکِ دکن میں اِن دنوں قدرِ سخن ۔ کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

مگر اب کے اور جب کے زمانہ اور زبان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اُس وقت وزیرِ دکن کو شوق تھا۔ خود بھی شاعر تھے اور شاداں تخلص فرماتے تھے۔ مگر اب شاہِ دکن کو خود شوق ہے اور اُنکی بدولت موجودہ وزیرِ دکن بھی جو اُسی سخن سنج۔ سخن فہم خاندان کی یادگار ہیں۔ وہاں کے شعرائے ہمعصر میں سبقت لے گئے ہیں گو اپنا تخلص شاد اپنے کلام و دیگر تصانیف میں درج فرماتے ہیں مگر اس تخلص کو اسم با مسمّٰے بنا کر تمام دکن و اہلِ جوہر کا دل شاد اور اُن کا گھر خوشی و خرّمی سے آباد کر رکھا ہے۔ اِن وجوہ پر خیال کر کے ہم لکھنؤ پر بھی حیدرآباد دکن کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ لکھنؤ کی زبان کا سرپرست دُنیا سے اُٹھ گیا۔ وہاں کی ریاست و سلطنت مِٹ مِٹا گئی۔ صرف نام ہی نام باقی ہے۔ مگر حف نظر چشم بد دور ملکِ دکن حرسہا اللہ عن الشرورِ والفتن کی اسلامی ریاست زندہ و سلامت موجود ہے اور تا قیامت رہے گی جس نے مامون رشید کا علمی زمانہ بھلا دیا۔ بغداد و قرطبہ کا لطف دکھا دیا۔ بلکہ اس تھوڑے سے زمانے میں خلفائے عباسیہ کی سلطنت سے بڑھا دیا اور بڑھا رہی ہے۔ اگر زمانہ ترقی کے موافق اُردو کا مرکز کہہ سکتے ہو تو بلحاظِ قدامت باعتبارِ بول چال و سرپرستی زبانِ اُردو حیدرآباد دکن کو کہو اور اُن سے اس زبان کی پختگی۔ قیام اور روزافزوں ترقّی کے واسطے مدد لو کیونکہ اس ریاست کا والی اردو زبان کا جوہری و مبصّر بلکہ نقّاد ہے اور اسی وجہ سے ہر ایک اہلِ زبان کی زبان پر حیدرآباد حیدرآباد ہے +

مرکزِ زبان کے متعلّق تو جو کچھ محاکمہ کرنا تھا وہ کر چکے اب ذرا اُس مضمون کو بھی پڑھ کر دیکھتے ہیں جس میں اس کے متعلق لمبی چوڑی بحث ہوئی ہے +

یہ مضمون حضرت **وجاہت** جھنجھانوی مالک رسالۂ **اصلاحِ سخن** نے بزمِ اُردو کے جلسۂ منعقدہ اُنیس ۱۹ مئی سنہ ۱۹۱۰ء میں پڑھا تھا اور سب سے پہلے ہمارے محترم دوست مولوی محبوب عالم صاحب نے اپنے معزّز و با وقعت روزانہ پیسہ اخبار مطبوعۂ تیسری جون سنہ مذکور میں چھاپا تھا۔ اسکے بعد رسالۂ اصلاحِ سخن و فصیح الملک میں ہماری نظر سے گزرا اور معلوم ہوا کہ دیگر رسائل میں بھی یہ بحث چھڑی ہے۔ مگر ہم اپنی بیماری۔ عدمِ فرصت و مقدمات دیوانی کی پیروی سے مجبور تھے ورنہ کچھ نہ کچھ ہم بھی اپنی رائے ظاہر کرتے۔ اب چند دوستوں کے سر ہو جانے سے رطب و یابس جیسا کچھ خیال میں آیا لکھنا پڑا۔ اس میں کلام نہیں کہ حضرت وجاہت نے جو کچھ لکھا بہ نظرِ اصلاح کہ یہ اُنکا کام ہی ہے نیک نیتی سے لکھا اور زمانہ چال و موجودہ رفتار کے موافق بظاہر بہت کچھ ذہن لڑایا۔ لیکن اس بحث کے اُٹھانے میں اُنھوں نے غالباً اپنی ناواقفیت کے سبب تمثیلوں تک میں دھوکا کھایا۔ اگر غلطی نہیں کی تو سہو ضرور ہوا۔ اور یہ غلط فہمی کتبِ لغات کے حال و قدیم محاورات میں فرق نکرنے کے باعث واقع ہوئی۔ مثلاً انھوں نے

لکھا ہے کہ اہلِ دہلی زیادہ محبّت کیواسطے "جان چھڑکنا" بولتے ہیں اور آگ لگ جانے کیواسطے "پھول پڑا" استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی اصل عبارت یہ ہے کہ " وہ زمانہ دُور نہیں کہ دہلی و لکھنؤ کے ایجاد کردہ الفاظ لوکل بولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھیں گے۔ مثال کےطور پر دہلی کے ایک آدھ محاورہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب کسی کو کسی سے زیادہ محبّت ہو تو دہلی والے کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی اُس آدمی پر جان چھڑکتا ہے۔ جان کیا ہوئی گویا گلاب یا کیوڑے کا عرق ہے۔ اب علمی دُنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اِتباع کیوجہ سے بے حد محبّت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اُس آدمی سے بے انتہا محبّت کرتے ہیں "

اوّل اِس فقرے کے پہلے حصّے کا جواب ملاحظہ فرمایئے کہ " دہلی اور لکھنؤ کے ایجاد کردہ الفاظ لوکل بولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھیں گے " ہم کہتے ہیں کہ یہی الفاظ روز بروز زیادہ ترقی کرینگے۔ اور ہر علم و فن کے الفاظ اسی زبان میں بڑھا کر اُسے علوم و فنون کے لحاظ سے بھی زیادہ مکمّل بنائینگے۔ کیونکہ انکی سادگی۔ سلاست۔ جامعیّت۔ وُسعت ایسی نہیں ہے کہ وہ دیگر زبان کے الفاظ تراش و خراش پیدا کرکے اپنے ساتھ شامل نہ کرلے۔ اُردو زبان میں ہر ایک زبان کی اِسی طرح کھپت ہے جس طرح شیخوں کی ذات کا ہر ایک مسلم و نومسلم کیواسطے دروازہ کھُلا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کا قول ہے۔

سیّد اکل کھرے ہیں میاں کائنات میں  سب کی سمائی ہوتی ہے شیخوں کی ذات میں

کوئی زبان۔ کوئی علم۔ کوئی فن اپنی خاص خاص اصطلاحات و محاورات سے خالی نہیں جن کاموں میں جس علم اور جس فن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اُسمیں اُنہیں کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ انشاپردازی کا جزوِ اعظم۔ قصّوں۔ ناولوں۔ ڈراموں۔ رزمیہ داستانوں۔ بزمیہ افسانوں کی جان اصطلاحیں اور محاورے نہیں ہیں تو اور کونسی بات ہے جو روتوں کو ہنساتی ہنستوں کو رُلاتی۔ لومڑیوں کو شیر بناتی سنگدلوں کو رحمدل کر دکھاتی۔ بخیلوں کو سخاوت کی طرف توجّہ دلاتی۔ قوموں میں ہمدردی پھیلاتی۔ قومی قوّت بڑھاتی سخیوں کو اُنکی حیثیت سے زیادہ دریا دلی پر آمادہ کردیتی ہے۔ صرف زبان اور محاورے ہی تو ہیں جو ہر ایک بیان کا سماں باندھکر لوگوں کے دلوں پر قابو کرا دیتے ہیں۔

کیا آپنے یہ نہیں سُنا۔ کہ یُورپ میں جس قدر نامی و گرامی مُقرّر یعنی اسپیکر ہوئے ہیں اور جس قدر بڑے بڑے انشاپرداز ہیں اُن سبنے اپنی اِس قوّت کو زیادہ تر ناولوں کے مُطالعہ سے بڑھایا ہے۔ اور وہاں ناول خاصکر اسی غرض سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں کہ اُن میں سے زُود اثر۔ پُراثر۔ دل گداز۔ ہیبت افزا۔ رعب نما۔ ہنسی خیز + وغیرہ ہر قسم کے فقرے یا الفاظ چُن چُنکر اپنی زبان پر چڑھائے اور

بروقتِ ضرورت حسبِ موقع کام میں لائے جائیں۔ یہ باتیں صرف ٹکسالی زبان کو حاصل ہوتی ہیں اور اُسی میں یہ جادُو بھرا ہوا ہے۔

رہے علمی اور فنونی الفاظ یا اصطلاحیں جس قدر اور جس وقت میں جس علم یا جس فن کا دور دورا ہوا اُسی کے واسطے سینکڑوں اور ہزاروں الفاظ بنگئے بلکہ اِن میں سے بھی بعض اصطلاحیں لے کر روزمرّہ میں داخل کر لی گئیں۔ مثلاً کھٹائی میں ڈالنا۔ سناروں کی اصطلاح ہے مگر اُردو میں تعویق کے موقع پر استعمال ہونے لگی علیٰ ہذا۔ انگرکھے کا بند۔ تیر بہدف۔ لیس ہونا بمعنی تیاّر و مستعد ہونا۔ کتر بیونت۔ پاپڑ بیلنا۔ چھکّے چھوٹنا۔ وغیرہ ہزاروں اصطلاحیں اور محاورے ایسے ہیں کہ وہ اہلِ حرفہ۔ اہلِ پیشہ اہلِ فن۔ اہل علم وغیرہ کے خاص خاص علوم و فنون سے اِستنباط کئے گئے ہیں۔ علم ریاضی۔ حساب۔ علم جبر و مقابلہ۔ اقلیدس۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ علم مثلّث۔ لوگارثم۔ مساحت وغیرہ کے ترجمے۔ کیا؟ حسبِ ضرورت نہیں ہوئے اور اب سائنس و طبیعات کے کیا؟ نہیں ہو رہے ہیں۔ اِسی طرح فقہ۔ حدیث۔ علم کلام۔ علم منطق وغیرہ کے ترجموں کو۔ کیا؟ اہلِ زبان نے چھوڑ دیا ہے؟ خاص ہماری دہلی میں خان بہادر منشی **ذکاء اللہ** مرحوم نے کون سے علم کا ترجمہ نہیں کیا۔ ایل ایل ڈی مولوی **نذیر احمد** صاحب نے عربی ترجموں سے کون سی دینی خدمت نہیں کی۔ اُردو میں منطق لکھی اور مضامین کے بیسیوں رسالے شائع فرمائے۔ مولوی **کریم بخش** صاحب نے جبر و مقابلہ کا کیسا ترجمہ کیا۔ مولوی **مملوک علی** نے عربی سے اقلیدس کا ترجمہ کیسا کیا۔ مولوی **امام بخش** صہبائی نے قواعد اُردو کیسی بنائی۔ **ماسٹر رامچندر** نے ریاضی میں کیسا نام پایا کہ یورپ تک دھوم مچ گئی۔ اِنکی کتابیں تذکرۃ الکاملین۔ رسالہ خواب۔ سریع الفہم وغیرہ اور بہت سے رسالے ہماری نظر سے گزرے۔ مولوی نواب **قطب الدین** خاں مرحوم نے کیا مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ نہیں کیا۔ کیا مولوی **نذیر حسین** صاحب محدّثِ دہلوی نے۔ مولوی **عبد الرب** واعظ دہلوی نے۔ مولوی **حفیظ اللہ** خاں صاحب دہلوی نے اُردو زبان کی دینی خدمت کچھ کم کی۔؟ ایل ایل ڈی مولوی **ضیاء الدین** صاحب نے کیا اصولِ علمِ طبعی کے رسالے نہیں لکھے؟ کیا مولوی **عبد الحق** صاحب نے اُردو میں تفسیر حقانی نہیں لکھی۔؟ کیا مولوی **رفیع الدین** صاحب نے لفظی اور مولوی شاہ **عبد القادر** صاحب نے قرآن شریف کا عام فہم اُردو با محاورہ ترجمہ نہیں کیا؟ کیا شمس العلماء مولوی **نذیر احمد** صاحب کا ترجمۂ قرآن مجید مقبولِ خاص و عام نہیں ہوا؟ کیا اِن باشندگانِ دہلی کو ان ترجموں کے واسطے لاہور۔ لکھنؤ۔ یا دیگر امصار و دیار کے الفاظ لانے پڑے؟

کیا سررشتۂ تعلیم پنجاب کے دہلوی مترجموں نے تعلیمی کتابوں کو اس زبان میں انگریزی سے نہیں ڈھالا؟۔ کیا مولوی **کریم الدین** نے کوئی اور زبان سررشتۂ تعلیم کی تصانیف میں برتی۔ کیا آپکو معلوم نہیں کہ کرنل **ہالرائڈ** صاحب بہادر نے اپنے سررشتہ کی کتابوں کا ترجمہ کس طریقہ سے ٹھیٹ اردو میں کرایا۔ اگر نہیں معلوم تو ہم سے سُن لیجئے؟ ہم بھی یہ کام بُک ڈپو کے نائب مترجم رہ کر کر چکے ہیں۔ وہ اول تو انگریزی دانوں سے جس کتاب کا ترجمہ مقصود ہوتا کراتے۔ جب وہ کر چکتے۔ تو ایسے دہلوی اہل زبانوں کو دیتے جو مطلق انگریزی نہیں جانتے تھے اور فرماتے کہ اسکو اپنی بول چال کے موافق بنا دو۔ انگریزی سے اکثر ترجمے رائے بہادر ماسٹر **پیارے لال** صاحب یا ماسٹر **حنیدو لال** صاحب یا مولوی **محمد یوسف** مرحوم کیا کرتے۔ اُن کی نظر ثانی کبھی مولانا **آزاد** صاحب کبھی خواجہ **ضیاء الدین** صاحب مرحوم۔ کبھی خواجہ **حالی** مدظلہ العالی۔ کبھی مولوی **مرزا اشرف** بیگ خاں صاحب کبھی مولوی **محمد سعید** صاحب۔ کبھی بندہ **سید احمد**۔ کبھی **مرزا ارشد** گورگانی۔ کبھی **سیف الحق** ادیب کبھی مولوی مرزا بیگ خاں صاحب دہلوی وغیرہ کیا کرتے تھے۔ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب نے جو کلاں **تاریخ انگلستان** یا **دربارِ قیصری** کا ترجمہ کیا ہے۔ بھلا کوئی دوسرا کرتو لے جس وقت لارڈ لٹن کی زبردست۔ معنی خیز۔ پہلو دار۔ مغلق اور زبردست اسپیچ کے ترجمہ کا موقع آیا۔ تو بندہ بھی سررشتہ میں اسوقت وہیں موجود تھا۔ اور کچھ اس نے بھی ماسٹر صاحب کے حکم سے اُسے دیکھا تھا انصاف یہ ہے کہ ماسٹر صاحب سا لائق آدمی ہو اور نہ یہ ترجمہ قابلِ تعریف کیا جائے۔ ان کے علاوہ قصص ہند حصہ اول وغیرہ بھی آپ ہی کی تالیف ہے۔ ان کتابوں میں اگر دہلی کے ایجاد کردہ لفظ نہیں ہیں تو کیا کرانے جھنجھانے سے یہ لڈوے کی پال آئی ہے۔ اگر یہ لوکل الفاظ مانے جائیں تو اور بھی زیادہ قابلِ وقعت ہیں کیونکہ خواص ہر جگہ محدود ہوا کرتے ہیں اور عوام غیر محدود۔ ۵

سب مذاہب ہیں یہی ہے نہیں اسلام میں خاص — کہ جہاں عام ہے ہوتا ہے وہاں عام میں خاص
ساغرِ دل کی تو واقف نہیں کیفیت سے — دیکھ عکسِ رخِ ساقی ہے اسی جام میں خاص

اب ذرا اُس مثال کیطرف رُخ فرمائیے جس کے سبب سے محاوراتِ دہلی پر پانی کاٹ کا حکم لگایا گیا ہے اور ساتھ ہی اُسکا مفہوم بھی اسطرح بتا دیا ہے "جب کسی کو کسی سے زیادہ محبت ہو تو دلی والے کہا کرتے ہیں کہ فلاں آدمی اُس آدمی پر جان چھڑکتا ہے جان کیا ہے گویا **گلاب** یا **کیوڑے** کا عرق ہے" اس محاورے کا لطف اور اسکی عدم واقفیت تو ہم آگے چلکر بیان

کریں گے۔ لیکن پہلے انہیں کی عبارت میں سے دو ایک فقرے پیش کر کے الزامی جواب دیتے اور انکی طرف سے یہ مصرعہ پڑھتے ہیں **مصرعہ**۔ میں الزام انکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔ یہ کانوں کو مزا نہیں دیتے "کان نہ ہو کوئی زبان ہوئی جو ذائقہ سے تعلق رکھے یہ صورتیں فسانہ ہو گئیں" "صورتیں نہ ہوئیں کوئی ذکر اذکار ہوئے جو فسانہ سے نسبت دیگئی" "دُنیا کی ہر چیز انقلاب پسند ہے" لفظ پسند کو ملاحظہ فرمایئے اور ہر چیز کو جو ذی روح بنا انقلاب پسند فرماتی ہے۔

خیر ان باتونکو جانے دیجئے۔ **جان چھڑکنا** اوّل تو یہ فرمایئے کہ آپنے اپنے کانوں سے سُنا ہے؟ کہاں سُنا ہے؟ اور کس سے سُنا ہے؟ مردوں سے یا عورتوں سے یا صرف **کُتبِ لغات** میں دیکھا ہے۔ یا کسی اُستاد کے کلام میں نظر پڑا ہے۔ بیشک جان چھڑکنا بولا جاتا ہے۔ مگر عورتوں میں اور وہ بھی اولاد یا مثلِ اولاد کسی نہایت قریبی رشتہ دار کی مُحبّت میں۔ نہ کہ عام محاورہ ہے اور ہر جگہ فرطِ مُحبّت کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ عورتیں اِس کی اصلیت سے واقف نہیں مگر اس موقع کے واسطے اِس سے بہتر اور پُر اثر لفظ مِلنا مشکل ہے۔ جان کے لُغوی معنی روح ہیں اور اَطِبا کی اصطلاح میں جوہرِ لطیف یا بخارِ لطیف۔ اِن دونوں صورتوں میں جان کا سیّال ہونا پایا جاتا ہے اور سیّال چیز کا چھڑکنا ممکنات سے ہے اور اِس جگہ فرطِ مُحبّت سے جان نثار کرنے کے معنی ہیں۔ اب ایک اور طرح سے سُنیئے۔ اُردُو محاورے میں جان بمعنی خون بھی آجاتا ہے۔ جیسے خوف کے موقع پر جہاں دم خشک ہونا بولتے ہیں وہاں جان سُوکھنا بھی استعمال کرتے ہیں اور دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ آپ نے کام سے جان چُرانا بھی سُنا ہوگا۔ بھلا اِس جگہ جان نہ ہوئی کوئی گٹھڑی یا جوکھوں ہوئی کہ کوئی چُرا کر لے جائیگا۔ حالانکہ صرف اُسی کی ذات کے متعلق بولتے ہیں۔ جو جان بُوجھ کر کام سے بچتا ہے۔ اب دیکھئے یہ گلاب کا عرق ہے یا کیوڑا۔ اور لیجئے جانفشانی فارسی کا محاورہ ہے اور اُسی کا یہ ترجمہ ہے۔ اہلِ فارس پر آپ کا اِس موقع کے لئے فرمایئے کیا اعتراض ہے۔ اِسی جگہ آپ فرماتے ہیں "کہ اب علمی دُنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ دہلی یا لکھنؤ کے اتباع کی وجہ سے بے حد محبّت کرنے کا مفہوم جان چھڑکنے سے ادا کرے۔ سیدھی بات کیوں نہ کہی جائے کہ ہم اُس آدمی سے بے انتہا محبّت کرتے ہیں" اگر آپ بے انتہا محبّت یا صرف کسی کے ساتھ محبّت کرنے کے دوسرے معنی پر توجہ فرماتے تو ہرگز ہرگز یہ لفظ زبان پر نہ لاتے۔ ایسی ہی باتیں آدمی کو پابندیٔ زبان سے آزادی حاصل کرنے پر مجبُور کرتی ہیں۔ ہمارے نزدیک علمی دُنیا کو سب سے زیادہ زباندانی کی ضرورت ہے ورنہ مفہوم کچھ ہوگا اور سمجھا کچھ جائے گا۔

اب دوسرے محاورے اور لفظ کو بھی ملاحظہ فرمائیے! آپ ارشاد کرتے ہیں کہ "اسی طرح کسی کے گھر میں آگ لگ جانے کا مفہوم اہل دہلی یوں ادا کرتے ہیں۔ کہ فلاں شخص کے گھر میں پھول پڑا۔ آگ نہیں کہتے۔ اِسکو وہ لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں۔ یہ اچھا پھول پڑا کہ سارا گھر جلکر خاک ہوگیا اور یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں۔ صاف بات کیوں نہ کہی جائے کہ فلاں آدمی کا گھر جل گیا" مہربانی فرماکر اوّل تو یہ ارشاد کیجئے کہ آپ کبھی دہلی میں آئے بھی ہیں یا نہیں؟ اگر آئے ہیں تو آپکو بگوش خود اس محاورے کے سُننے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی کتاب یا کسی شعر میں دیکھ لیا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اِس محاورے کو عورتیں بولتی ہونگی یا مرد۔ اگرچہ آپ کا یہ فقرہ صاف ظاہر کررہا ہے کہ اِسکو وہ لوگ بدشگونی سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ محاورہ ہو نہ ہو عورتوں کا ہو۔ کیونکہ یہی فرقہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالتا جس سے بدشگونی ہو۔ مثلاً "خیر سے" آپ نے ہی کئی جگہ برتا ہے "خدا کی سنوار" بجائے خدا کی مار آپنے سُنا ہی ہوگا "تمہیں خدا کی نیکی" بھی گوش زد فرمایا ہوگا "وہ جمی جم گھر میں ہیں" یہ بھی کبھی نہ کبھی ضرور گوش آشنا ہوا ہوگا۔ اسی طرح **پھول پڑنا** بھی ظاہر کررہا ہے کہ اِسکو عورتیں ہی بولتی ہونگی۔ مگر آپنے اپنے ثبوت میں مرد و زن سب کو لے لیا۔ اور بہت بڑی اپنی ناواقفیت ظاہر فرمائی۔ اب ہم سے سُنیئے دہلی میں کوئی بھی اِس محاورے کو اب نہیں بولتا اور نہ پہلے یہ محاورہ شہر کے اندر بکثرت بولا جاتا تھا۔ البتہ قلعہ مُعلّے میں بیگماتوں نے اِسکا کسی قدر استعمال کر رکھا تھا۔ لیکن عام آگ لگنے کے واسطے نہ تھا۔ اگرچہ **رنگین** کے ایک شعر میں یہ محاورہ موجود ہے مگر اُس میں جو لفظ **گوئیاں** آگیا ہے یہ اِس امر میں شُبہ ڈالتا ہے۔ کیونکہ گوئیاں خاص پوربی محاورہ ہے جو آجتک دہلی کیا اطرافِ دہلی میں بھی نہیں بولا جاتا۔ وہ شعر یہ ہے۔ ؎

بھول کر بھی جو کسی اور کے گھر پھول پڑے تو الٰہی کرے گوئیاں مرے گھر پھول پڑے

عجب نہیں جو یہ شعر انشاء اللہ خاں کا ہو اور اگر بالفرض رنگین کا مانا جائے تو اُس زمانہ کا ہوگا جس زمانہ میں سعادت یار خاں رنگین لکھنؤ میں جاکر اپنے پگڑی بدل بھائی انشاء اللہ خاں کے ہاں ٹھیرا کرتے تھے۔ اور باہم دونوں صاحبوں کی ریختیوں کا موازنہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن **رشک** لکھنوی نے اِسکو صاف کردیا ہے چنانچہ اُس کا شعر ہے۔ ؎

اہلِ جنّت کو ہو جنّت پہ جہنّم کا خیال پھول اگر پڑ جائے میری آہِ آتش بار کا

؎ پہلا مصرعہ سرتاسر محاوروں سے پُر ہے۔ اور خاصکر پھول پڑجائے تو ہر ایک کی سمجھ میں بھی مشکل سے آئیگا۔

اِس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ کسی شاعر نے بھی نہیں باندھا۔ جن لوگوں نے مردانہ زبان کا نام ریختہ اور بیگماتی بول چال کا نام ریختی رکھ چھوڑا تھا۔ اُنھوں نے اُس زمانہ میں شاذ و نادر باندھا ہے۔ اہلِ لکھنؤ میں سے بحر اور انشا نے صرف ایک ایک شعر میں استعمال کیا ہے۔ اور اہلِ دہلی میں سے نکہت اور رنگین نے۔ اِن کے سوا ذوق۔ ظفر۔ مومن۔ درد۔ غالب وغیرہ کسی نے بھی اِسکا استعمال نہیں فرمایا۔ اگر یہ محاورہ مروّج خاص و عام ہوتا۔ تو کوئی بھی اِسے نہ چھوڑتا۔ اہلِ لغت کو چونکہ ہر زمانہ کا محاورہ دکھانا منظور تھا اُنھوں نے بیشک داخلِ لغات کر دیا۔ محاورہ کی خوبی میں شبہ نہیں لیکن آپنے بے وقت مثال دی۔

پھول کے لفظ پر آپنے طعنہ مارا تھا یہاں وہ طعنہ بیکار رہا بلکہ آپنے جو لکھا ہے کہ "یہاں خیر سے انگارے کو ابھی تک پھول ہی سمجھے بیٹھے ہیں" سبحان اللہ کیا اچھا خیال ہے۔ انگارے کی تعریف بھی جناب کو معلوم نہیں۔ کیا انگارا اُڑ کر جا سکتا ہے؟ یا انگارا اُڑ سکتا ہے؟ اگر آپ اِن الفاظ کے محلِ موقع سے واقف ہوتے تو اس جگہ چنگاری۔ شرارہ۔ یا آگ کا پتنگا تحریر فرماتے۔ دیکھئے اہلِ زبان اور مقلدِ زبان میں کس قدر فرق ثابت ہوا۔

اب دوسری طرح سے اِسکا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ جب کوئلے جلتے وقت چٹختے ہیں تو اُن کو آپ کیا فرمائیں گے۔ کیا اُن کے روشن ذرّوں کو پھول یا چنگاری یا پتنگے سے تعبیر نہیں کریں گے؟ کبھی آپنے چراغ کو بھڑکتے ہوئے دیکھا ہوگا تو اُس وقت جو روشن پتنگا سا یا اُسکی جلتی ہوئی ٹیم نیچے گرتی ہے تو اُسے بھی پھول کہتے ہیں یا نہیں؟ کیا توا جس وقت جلتے ہیں جلگ جلگ کرتا ہے۔ تو اُسے توا ہنسنا کس وجہ سے کہتے ہیں یا نہیں۔ آتش بازی کے پھول تو آپنے ضرور سُنے ہوں گے۔ اِنکو انگارا کیوں نہیں کہا۔ پھلجھڑی۔ ہتھ پھول۔ مہتابی۔ انار۔ جائی جُوئی۔ بتاسے وغیرہ آتشبازی میں نظرِ اقدس سے گزرے ہونگے۔ اِنمیں سے انگارے اُچھلتے ہیں یا پھول نکلتے ہیں۔ تیسری مثال اور لیجئے۔ مُنہ سے پھول جھڑنا کیوں بولتے ہیں۔ مُنہ نہ ہوا کسی باغ کا بوٹا یا گُل گلزارِ وجاہت ہوا۔

ہم نے آپکے پہلے اعتراض اور اُسکی مثال کے متعلق آپ ہی کے فقروں سے تھوڑا سا الزامی جواب دیا تھا۔ اب آپ اُسکی نسبت اور نظیریں بھی ملاحظہ فرمایئے۔ زبان دینا کس معنی میں آپ خود بولتے ہیں۔ کیا زبان کی بوٹی کاٹ کر دیدیجاتی ہے۔ یا زبان نکال کر حوالہ کر دیجاتی ہے۔ یہ وہ لفظ ہے جو آپکے روزمرہ میں داخل ہے۔ سانچ کو آنچ نہیں۔

کیا سانچ کوئی مجسّم چیز ہے۔ یا کوئی درخت یا از قسمِ نباتات ہے؟ اسی طرح پیسہ کی آنچ۔ کیا پیسہ
کسی قسم کی آگ ہے؟ تلوار کی آنچ۔ کیا تلوار کوئی شعلہ ہے؟ آنچ آنا بمعنی صدمہ پہنچنا بھی آپنے
سُنا ہی ہوگا۔ چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ تمہارے بچے کو ذرا آنچ آئے تو میرا ذمہ۔ اَب پھُول کے
چوتھے معنی اور لیجئے کہ پتّی یا برگ کے معنی میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ مثلاً سوکھی میتھی کے
دو پھُول ڈال دینے سے مچھلی اُڑ جاتی ہے یعنی خوشبودار اور خوش ذائقہ ہو جاتی ہے۔ پُوربی
زردے یعنی تمباکو کے دو پھُول بھی سر پھرا دیتے ہیں۔ بھنگ کے دو پھُول مانگ کر نشہ جمالو
ابھی سیاہی پھیکی ہے دو پھُول اور ڈال دو۔ پانچویں اور لیجئے برص یا کوڑھ کے دھبّے اور
دوآتشہ شراب کو بھی پھُول کہتے ہیں۔ چھٹے معنی بھی ملاحظہ فرمائیے کانسی دھات کو بھی پھُول
کہتے ہیں۔ پھُول کا کٹورا۔ پھُول کی تھالی۔ سینکڑوں دفعہ سُنی ہوگی۔ معلوم نہیں یہ کس درخت
اور کس موسم کے پھُول ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اِس قسم کے سینکڑوں اور بہتیرے استعارے
یا محاورے ہیں جو ہر ایک زبان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ زبان کی خوبی
اِنہیں باتوں پر موقوف ہے۔ اور تو اور گنواری یعنی ادنےٰ سے ادنےٰ دہقانی زبان بھی ایسے
استعاروں اور محاوروں سے خالی نہیں پائی جاتی۔ کجا کہ شہری اور خاص کر ٹکسالی زبان اِن سے
مُعرّا ہو۔ یا بائی کاٹ یعنی متروک الاستعمال کر دیجائے۔ گنوار لوگ بیوقوف کو **بچھیا کا باوا**
کہتے ہیں۔ کیا وہ درحقیقت گاؤزادہ ہوتا ہے۔ پنجاب کے عوام الناس نافہم کو **ڈھگا** کہتے ہیں۔ کیا
وہ فی الواقع بیل ہوتا ہے۔ گدھا اسی معنی میں تمام ہندوستان کیا عرب تک میں مستعمل ہے
آپنے سُنا ہوگا الکاتب کالحمار۔ علیٰ ہذا **ہری چُگ** خودغرض کے حق میں۔ **لادجانا**
دُودھ سے ہٹ جانے کے موقع پر۔ **پسر چرانا** پچھلی رات سے ڈھور چرانے لیجانے
کو۔ **بیس بسوے** بجائے غالباً۔ **سو بسوے** یا **بیسوں بسوے** بجائے بالضرور۔
شرطی۔ **بیچ کھیت**۔ بجائے علانیہ۔ بیٹی کا باپ بجائے نامرد یا بودا۔ **ٹھور رکھنا**۔
بجائے کھیت رکھنا۔ کام تمام کرنا۔ **سُوت کے بنولے کر دئے**۔ بنا بنایا کام بگاڑ
دیا۔ قدر گھٹا دی۔ **جیوڑی** سے گردن گھسنی۔ تمام عمر نباہ کرنا۔ **لٹیا ڈبو دی**۔ بات بگاڑ دی
**پھاڑے کا ٹٹّو** جو بھروسے کے قابل نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری گنواری باتیں اصطلاحات
سے خالی نہیں ہیں۔ **میسور اور بمبئی** کے خیال سے اِن سب کو بائی کاٹ فرمائیے بلکہ دیہاتی
تعلیمی کتابوں میں سے بھی نکال دیجئے +

اب فرمائیے اس مثال سے کس کا گھر جلکر راکھ ہو گیا۔ اور کس نے انگارے کو پھول سمجھا۔ کلکتہ ہو یا بمبئی۔ لاہور ہو یا پشاور۔ ملتان ہو یا بلوچستان جہاں کے لوگ اُردو کو اُردو سمجھ کر بولینگے۔ اُسکی تصانیف پڑھینگے۔ وہ سب جان لیں گے کہ کہاں کونسا محاورہ بولا جاتا ہے۔ اوّل تو آپ کا یہ دعویٰ ہی غلط تھا کہ دہلی میں پھول پڑنا آگ لگنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جس حالت میں آجکل کے اہل دہلی نے نہیں سُنا۔ اور نہ زبان پر لائے تو آپنے کہاں سے سُن لیا۔ یوں فرمائیے کہ ایک اعتراض جڑنا تھا سو جڑ دیا اور وہ بھی بلاتحقیق۔ بلامشاہدہ اور بلاتجربہ۔ کسی پُرانی کتاب میں دیکھکر۔

علمی زبان جو شاید خود آپ ایجاد فرمائیں وہ تو اس لوکل امتیاز کو مٹا دیگی۔ مگر پہلے آپ نے تو اس لوکل زبان کو اپنے مضمون میں عرصہ ہوئے دیا ہوتا۔ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ لوکل محاورے نہیں ہیں تو اور کون سے ہیں جو آپنے تحریر فرمائے ہیں۔ **جُوتیاں چٹخاتے پھرنا۔ خالی مُوچھوں پر تاؤ دینا۔ جو جی بچیگا دیکھ لیگا۔ گھر میں چُوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ پھُولنا پھلنا۔** دقیانوسی محاورے۔ کیا ان کو بمبئی یا میسور والے بخوبی سمجھ لیں گے۔ اور دقیانوس کی تاریخ اور اسکی وجہ تسمیہ پر انکو فوراً عبور ہو جائیگا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تاوقتیکہ اہل زبان کی تصانیف اُنکی نظر سے نہیں گزریگی۔ آپکے ان محاوروں کو بھی وہ نہیں سمجھ سکیں گے۔ اور تو اور آپکی تازہ نظم **مسلم یونیورسٹی** بھی دہلی کے محاوروں سے خالی نہیں۔ مثلاً ڈنکا بجانا۔ جامہ پہننا۔ چھاتی پر مُونگ دلنا۔ بیل منڈھے چڑھنا وغیرہ۔

اب ذرا اپنے خاص الخاص محاورات پر بھی نظر ڈال لیجئے جس سے معلوم ہو جائے کہ آپ نے باوجودیکہ اصلاح سخن کے مدعی ہیں کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ **ٹکے بھر کی زبان** اسکی بجائے ٹکاسی یا ٹکا بھر کی زبان فرما سکتے تھے۔ ٹکے بھر نہیں بولتے اظہارِ مقدار کے واسطے ایسے موقع پر ٹکا بول سکتے ہیں۔ حقہ کی ستو لتر گڑگڑاہٹ پر بیشک کہتے ہیں کہ ٹکے گن رہا ہے" **شاہی تاج زمین پر گر پڑا"** اس کی بجائے شاہی تاج تاراج یعنی غارت ہوا کہتے ہیں "گنے چنے باکمال" اسجگہ صرف گنتے کے باکمال بولتے ہیں "دل جسم کا بادشاہ ہے زبان اُس کی وزیر" دہلی اور لکھنؤ کے محاورے گھس پھٹ کر پُرانے ہو گئے" یہ اسکی جگہ گھس پس کر کہا ہوتا۔ مگر یہ محاورہ بھی عورتوں ہی میں کپڑے کے ساتھ زیادہ مستعمل ہے۔ چونکہ آپنے زبان کو اپنے دعوے کے برخلاف کپڑے سے استعارہ فرمایا اس وجہ سے اس پر زیادہ بحث نہیں کیجاتی اسوقت آپکا ایک شعر بھی یاد آگیا۔ جو ایڈورڈ ہفتم کی وفات پر لکھا ہے۔ جس میں طوطی بجا کا محاورہ خاص آپ ہی کا ایجاد ہے۔ ؎

وجاہت آج نوبت اٹھ گئی اڈورڈ ہفتم کی     بجی ہے دھوم سے دُنیا میں طوطی جارج پنجم کی

سلہ سید محمد تقی میر نے اپنے مرغ کے مرثیہ میں جو وقت بلی نے اُسکی گردن مروڑکر پھینک دی۔ اور وہ اسکے پنجوں میں آگر گری۔ ایک لطف پیدا کرنے کے واسطے تاج خروس کی مناسبت سے یہ شعر موزوں کیا تھا۔ اور غالباً اُسی کی پیروی یہاں کی ہے ؎
جھکاے سونے قدم سرخرو میں سے جان کا ❊ زمیں پہ تاج گرا ہے سلیمان کا

اب میں آپ کے باقی امور کی طرف لگتے ہاتھ چند حق حق باتوں کو تسلیم کرکے اور قابلِ اعتراض اُمور کا مختصر جواب دیکے اِس مضمونکو ختم کرتا ہوں ورنہ یہ بحث اس قدر طویل ہے کہ برسوں میں بھی ختم نہ ہو اور ایک ایک اصطلاح یا محاورہ ورق کے ورق سیاہ کرادے۔

زبان کی صرف اتنی تعریف جامع نہیں کہ "زبان اُس طرز و اندازِ گفتگو کا نام ہے۔ جس سے ایک دوسرے پر خیالات کا اظہار کیا جائے" بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ زبان اُن الفاظ و کلمات کا نام ہے۔ جن سے اپنا مفہوم دوسروں پر حسبِ موقع اندازِ گفتگو کے ساتھ ظاہر کیا جائے۔ کیونکہ صرف طرز و اندازِ گفتگو کا نام زبان نہیں ہے۔ بلکہ موقع بھی شرط ہے۔ زمانۂ حال کے ایک نامی لاہوری اُردو اخبار میں ہماری نظر سے گزرا کہ نیولا چالاکی سے سانپ پکڑتا ہے۔ یہ دراصل انگریزی سے ترجمہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ مترجم کو اس موقع اور محل کا لفظ معلوم نہ تھا۔ اُس نے چالاکی ترجمہ کر دیا حالانکہ وہ پھُرتی کا موقع تھا۔ گو چالاکی از روئے معنی اُس کا مترادف ہے مگر اِسجگہ محاورے کے برخلاف ہے۔ جس سے نیولے کی صحیح تعریف ادا نہ ہوئی۔ علیٰ ہذا ایک دفعہ یہ فقرہ نظر سے گزرا "فی الحال مسلمانوں کو اُردو زبان کی تحصیل پر چل پڑنا چاہئیے اہلِ دہلی جھک مارتے ہو" ایک حال کی تالیفات کیا قدامت سے پُرانے اور نئے الفاظ میں تغیر و تبدل ہوتا آیا ہے۔ مگر لہجہ نہیں بدلا۔ آپکا یہ فرمانا آپ کے نزدیک ٹھیک ہوگا کہ "لکھنو اور دہلی نے پچاس سال میں کچھ بھی لٹریری ماسٹر تیار نہیں کئے" اگر حضرت **شرر** غدر سے پیشتر کی پیدائش نہیں ہیں اور غالباً نہ ہونگے کیونکہ اُن کے چہرہ مبارک سے اتنی بڑی عمر نہیں پائی جاتی تو یہ کس پچاس سال میں شمار ہونگے علیٰ ہذا سید **سجاد حسین** صاحب اڈیٹر اودھ پنچ وغیرہ۔ رہی دلّی اس غریب پر اگرچہ غدر کی طفیل یہ آفت آئی کہ اوّل تو یہاں کے نامی علماء و فضلا کا صفایا ہوا اور اگر کچھ رہے تو انہیں عدمِ اطمینان اور فکرِ معاش نے تنگ کیا۔ سب سے بڑا غضب یہ ہوا کہ دہلی کالج جہاں سے بڑے بڑے لائق لٹریری مین تیار ہو کر نکلتے۔ صرف بارہ برس دہلی کی ہوا کھا کر لاہور سدھارا۔ اگر مسلمانوں کو اِس زمانہ میں بھی انگریزی سے رغبت ہوتی تو دس بارہ برس کے عرصے ہی میں بہت کچھ کر دکھاتے۔ اِس کے علاوہ قلعہ کے اُجڑنے سے اُن کو پیٹ کی پڑگئی۔ **لٹریری مین** کیونکر بنتے۔ جب کسی کام پر کمر باندھکر اُٹھے۔ اگر ایک وقت کی روٹی بھی بے فکری سے مل گئی تو اِن کی غفلت۔ اِنکی سستی۔ اِنکی کاہلی نے یہی کہا۔ (**لیٹ رہو مین**)

جب خدا دے کھانے کو تو بلائے جائے کمانے کو ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے  عاقبت کی خبر خدا جانے

مگر اس پر بھی لٹریری مینوں کی کمی نہیں ہوئی۔ اوّل ہمارے ہندو ہم وطن بھائیوں کو دیکھو کہ اُنھوں نے

اِس تھوڑے سے وقت میں بھی اپنا کیسا جوہر دکھایا۔ دیوان سر پرام صاحب ایم۔ اے علمِ تاریخ کے کیسے ماہر نکلے۔ لیکن ریاستِ الور کی مدارالمہامی نے تصنیف و تالیف کی مہلت نہ دی۔ آنریبل۔ رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا کس پایہ کے لائق ہوئے کہ اُردو میں صرف علمِ منطق پر ہی نہایت عمدہ رسالہ نہیں لکھا بلکہ قانونی کتابوں کے ترجمہ کے علاوہ میونسپل ایکٹ۔ کورٹ ایکٹ۔ ایکٹ مزارعانِ پنجاب۔ ایکٹ لگان پنجاب۔ لوڈ ایکٹ پنجاب وغیرہ تک بناکر تیار کردیئے۔ اور اپنی روشن دماغی اِس قدر ثابت کی کہ سب سے پہلے وُہی آنریبل ہوئے۔ وائسرائے کی کونسل میں داخل ہونے والے تھے کہ اکیاون ۵۱ برس کی عمر میں چل بسے۔ لالہ سر پرام صاحب ایم اے۔ خلف الرشید آنریبل لالہ مدن گوپال صاحب مدونِ تذکرۂ ہزار داستان یعنی خمخانۂ جاوید جنھوں نے اساتذہ کے ناپید دیوان بہم پہنچاکر شائع فرمائے۔ کمالِ دہلی رسالہ نکلوایا ایک اعلیٰ درجہ کے لٹریری مین ہیں۔ رائے بہادر ماسٹر ساگر چند صاحب جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کے ماہر کامل اور سررشتۂ تعلیم پنجاب کے فیض رساں رکن اعظم ہیں۔ رائے حکم چند صاحب ایم اے کا حیرت افزا ذکر سنیں تو آپ یوُنہیں رہ جائیں۔ جس زمانہ یعنی ۱۸۶۹ء میں اِنھوں نے ایم اے کا امتحان دیا تھا تو اُسوقت شمالی ہند میں متعدد کالج تھے۔ دہلی کالج جسے ابھی چھ سات برس ہی جنم لئے ہوئے گزرے تھے۔ اِسی کالج سے رائے صاحب نے ایم اے کا امتحان دیا اور تمام یونیورسٹی میں سب سے اوّل رہے۔ خیر لکھنؤ اور دہلی کو جانے دیجئے مگر کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج سے بازی لیجانا کارے دارد۔ کیونکہ بنگالی ماشاءاللہ علمی ترقی میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انگریزی اُنکی مدر ٹنگ بنگئی ہے۔ دماغ یوُرپ کے عالی دماغوں سے ٹکر کھانے لگا ہے۔

اِس کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کی ۱۸۷۳ء کے بنگال اور اُڑیسہ کے قحط میں وہ لیاقت دکھائی کہ ۱۸۷۷ء کے دربارِ قیصری کے موقع پر وائسرائے ہند نے اپنے دستِ مبارک سے دو طلائی تمغے مرحمت فرمائے۔ اگرچہ جوڈیشل سروس پنجاب سے ۱۸۹۲ء میں استعفانہ دیتے تو چیف کورٹ کی ججی کیواسطے بھی رپورٹ ہوگئی تھی۔ اب قانونی لیاقت کی طرف توجّہ فرمایئے۔ تعزیراتِ ہند کی اُردو شرح۔ ضابطۂ دیوانی اور ضابطۂ فوجداری کی اُردو شرح ایسی مقبولِ عام لکھی کہ انہیں ایک مطبع کرکے ماہواری قانونی رسالہ نکالنا پڑا۔ اِس کے علاوہ لاء اوف کنسینٹ (Law of Consent. کا نہایت عمدہ اور سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ جس نے دقیق سے دقیق قانونی اصطلاحوں۔ ادق مضامین کو اُردو میں نہایت آسان اور پانی کرکے دکھادیا۔

اِس کے بعد جب آپ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے اور لیجس لیٹیو کونسل کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ تو وہاں بسر پرستیٔ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی متعالی (Ris pidicete) یعنی دفعہ تیرہ ضابطہ دیوانی کی شرح ہزار صفحوں پر ایسی مبسوط اور مُدلّل لکھی کہ امریکہ - فرانس اور انگلستان کے نامور مُقنّنوں نے اِن کی عالمگیر واقفیت و معلومات کی صرف داد ہی نہیں دی۔ بلکہ اِنکے شرقی دماغ پر حیرت ظاہر کی۔

اگر ہندوستان کی کسی دوسری جگہ کا آدمی ایسا لائق ہوا ہو تو وہ ہمیں دکھا دو۔ لیکن اِنکو بھی بدنظروں کی نظر کھا گئی۔ سائم صاحب بہادر کو اپنے اِن شاگردوں پر ناز تھا اور دہلی والوں کی روشن دماغی کی نظیر میں اِن کے نام پیش کیا کرتے تھے۔ لالہ سورج نرائن متخلّص بہ مہر نے سررشتۂ تعلیم پنجاب میں علمی کتابوں کی تصنیف سے جو کچھ مدد دی وہ ابتک پڑھائی میں داخل ہیں۔ اور کلام مہر اُن کی انوکھی شاعری کا اعلیٰ نمونہ۔

لیٹنر صاحب کی دشمنی بھی اِن کا کچھ نہ کر سکی۔ البتّہ شاہجہاں آباد کا پہلا سا علمی عزّ و شرف صرف انگریزی کی طرف توجّہ نہ کرنے اور یہاں موجودہ سلطنت کا دارالصدر یا دارالحکومت نہ ہونے سے جاتا رہا۔ بلکہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہلِ حرفہ۔ دستکاری پیشہ لوگوں نے تو پیٹ بھر لینے کو کافی سمجھا اور جو کھاتے پیتے تھے اُنہوں نے اپنا آبائی علم و ہنر چھوڑ کر یا تو دوسری طرف توجہ نہ کی یا بساط سے زیادہ مدارس کے اخراجات کی برداشت نہ کر سکے۔ قُوتِ لایموُت پر مٹے رہے۔ لیکن پھر بھی اصحابِ ذیل اِس وقت اپنا جوہرِ طبیعت ایسا دکھا رہے ہیں کہ آپ کو اِن کا نام سُنکر اپنی ناواقفیت پر آپ افسوس آئے گا۔

خان بہادر میر ناصر علی صاحب مالکِ صلائے عام۔ مضمون آفرینی۔ مضمون نگاری۔ متانت۔ بلاغت۔ ظرافت میں کیسے شہرہ آفاق ہیں۔ شیخ محمد عنایت اللہ صاحب بی۔اے خلف منشی ذکاء اللہ مرحوم مُصنّفِ تذکرۂ ابو ریحان بیرونی و مُترجّم مضامین اشاعت الاسلام مُصنّفہ جناب ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب اور نیز آپنے پریچنگ آف اسلام کا قابلِ قدر ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا لیکن موجودہ ملازمت نے اِنکا سارا وقت لے لیا ہے۔ جس سے یہ مجبور ہیں۔ مولوی احمد حسن صاحب سابق تعلّقدار ریاستِ نظام علمِ عربی کے بڑے ادیب۔ تفسیر قرآن کے مفسّر اور ترجمہ مشکوٰۃ کے نامی مُترجّم ہیں۔ مولوی سیّد اشرف حسین صاحب بی۔اے جنہوں نے میر حسن کی مثنوی کا دیباچہ لکھا اور مخزن پریس میں مع مثنوی طبع ہوا۔ حافظ سیّد حسین صاحب عرشی

ہمشیرزادہ مولوی نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی جن کے مختلف مضامین نظم و نثر مخزن و عصمت میں نکلتے رہتے ہیں اور آجکل آپ تذکرۂ خواتین دکن و سلطانہ چاند بی بی تصنیف فرما رہے ہیں۔ مولوی بشیرالدین احمد صاحب مصنف حرزِ طفلاں و اقبال دُلہن وغیرہ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری۔ مصنف صبح زندگی۔ منازل السائرہ۔ صالحات۔ وغیرہ۔ قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی مصنف شاہد رعنا۔ سعید و سعادت۔ انگریزی سلکشن آف دی قرآن۔ ڈاکٹر مشرف الحق صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی جنہوں نے انگلستان کے کتب خانہ کی لسٹ بڑی قابلیت سے تیّار کی۔ اور ان کے مضامین مخزن میں نکلے ہیں۔ مولوی عبدالجبار۔ مولوی عبدالستار خیری۔ ایم۔ اے۔ امریکہ یونیورسٹی جنہوں نے بیروت میں مسلمانوں کا دارالعلوم قایم کر دیا۔ اور اُس کے کورس تیار کئے۔ ماسٹر سید ذاکر حسین صاحب مصنف اتالیق انگریزی۔ پاکٹ ہسٹری وغیرہ۔ یہ دس پانچ برس سے ایک اور عظیم الشان تاریخ ملازمت چھوڑ کر لکھ رہے ہیں۔ جو یقین ہے اس سال میں ختم ہو جائے۔ ان کی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ جنکا ہمیں اسوقت نام یاد نہیں۔ مولوی انعام الحق و مولوی احتشام الدین جن کے مضامین اور جن کی کوشش سے رسالۂ خاتون نے جنم لیا۔ مولوی احمد علی خاں جنکے دم سے سلسلۂ اتالیق نسواں تیّار ہو کر شائع اور مفید مستورات ہوا۔ مولوی نصرت علی مالک نصرت الاخبار۔ شیخ نورالٰہی مصنف ناخواندہ مہمان و قتلِ شوہر وغیرہ۔ ان کے علاوہ منشی درگا پرشاد نادر مصنف کتب متعددہ بھی قابل ذکر ہیں۔ جب یہ لیٹریری مین نہیں شمار ہو سکتے تو اور کون سے ہو سکتے ہیں۔

زندہ دلانِ پنجاب خدا اُن کی ہمت۔ اُن کی اولوالعزمی۔ اُن کے استقلال میں برکت دے باوجودِ عدم فراغبالی اس طرف جھک پڑے اور ایسے جھکے کہ اپنے وطن۔ اپنی قوم کی ناک کیا لاج رکھ لی۔ ہمیں اُن پر فخر کرنا چاہیئے۔ دنیا میں ترقی ایک ہرتی پھرتی چھاؤں ہے۔ لیکن یہ اب بھی ہم کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مقامی اثر کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ ہر ایک چیز اپنی خاص جگہ میں خوب پھولا پھلا کرتی ہے۔ اور اصل جوہر وہیں دکھایا کرتی ہے۔ کشمیر کو زعفران کے ساتھ۔ باڑے کو چاولوں کے ساتھ۔ سردلی کو آموں کے ساتھ۔ سہارنپور کو نیشکر کے ساتھ۔ لمبے لمبے بالوں کو بنگالہ کے ساتھ۔ ناگپور کو رنگتروں کے ساتھ۔ بمبئی کو کیلوں کے ساتھ بنگالہ اور دکن کو تاڑی کے ساتھ۔ اننّاس اور ناریل کو کلکتہ کے ساتھ۔ لاہور کو بید مشک کے ساتھ۔ میسور کو صندل کے ساتھ۔ جو مناسبت ہے۔ وہ ہر ایک سرزمین کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

بقولِ شخصے مانگے کے پروں سے اُڑا نہیں جاتا یعنی آمد اور آورد میں بہت بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس پر بھی زبان اُردو میں جس قدر انہوں نے ترقی کی۔ قابلِ داد و صاد ہے۔ مگر محاورات کے اختراع کرنے اور مادری زبان کی طرح اُس پر قابو پانے سے ابھی کوسوں دُور ہیں اور یہ فرق اگر اہلِ دہلی بھی اُجڑ کر وہاں جا بسیں تو لاہور کے خطہ کی آب وہوا اِس صورت میں بھی پنجاب کے لب ولہجہ کو چھوڑ کر تاوقتیکہ دہلی میں جنم نہ لیا جائے یہاں کے لب ولہجہ میں شامل نہ ہونے دے۔ اہلِ فارس کا لب ولہجہ اہلِ ہند کہاں سے لا سکتے ہیں۔ اہلِ عرب کی طرزِ گفتگو کیوں کر پیدا کر سکتے ہیں۔ یورشین اور یورپین کی زبان میں کیوں فرق ہے۔ کرنٹوں کی انگریزی اور دو غلوں کی انگریزی میں کیوں بل ہے اٹیلین حرف ڈی کیوں نہیں نکال سکتے؟ یہ ساری باتیں مقامی اثر سے متعلق ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جس طرح غیر ممالک کے مصنفوں نے طول طویل کتابیں دوسری زبانوں میں لکھیں۔ علوم وفنون کے ترجموں سے اپنے ہموطنوں کو بڑے بڑے فائدے پہنچائے اِسی طرح اہلِ پنجاب پہنچا رہے ہیں۔ البتہ شعر گوئی میں جس طرح اہلِ لکھنؤ اساتذہ کے کلام سے یا اصلاح سے مدد لیکر خاصے زباندان بن گئے ہیں۔ اِسیطرح باشندگانِ لاہور بھی اُن سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ بلکہ لکھنؤ اور دہلی کی مسافت کا فرق ہانکے پکارے یہ کہ رہا ہے کہ لاہور ضرور ایک دن دہلی کا بچہ بنجائیگا۔ اور اب بھی اُسمیں اُردو زبان کے ایسے لائق اہلِ سخن پیدا ہونے لگے ہیں کہ اُنھوں نے حضرتِ داغ کا پورا پورا تتبع کر کے دکھا دیا ہے۔ بلکہ مغربی وفلسفی خیالات کی چاشنی نے مضامین کے لحاظ سے شاگردوں کو بھی مغربی اُستاد بنا دیا ہے۔ لیکن اِس صورت میں بھی ہم لاہور کو مرکز کہنے میں مبادرت نہیں کر سکتے اور اِس کا ادنےٰ سا ثبوت یہ دے سکتے ہیں کہ لاہور کا کوئی سا تعلیم یافتہ کوئی سی ٹھیٹ اُردو عبارت لکھکر اُسی عبارت کو اہلِ دہلی سے مِلاکر دیکھ لے۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات اہلِ زبان کے برخلاف اُسمیں پائی جائے گی۔ گو لغوی غلطیوں سے۔ صرفی غلطیوں سے وہ پاک ہے۔ مگر آب وگِل کے اثر کو نہیں بدل سکتی۔ یہ کہنا غلط بلکہ محض خوشامد ہے کہ لاہور ٹھیٹ اُردو زبان کا مرکز کہے جانے کی قابلیت رکھتا ہے۔ ہاں ہندوستانی زبان یا اُردو مخلوط زبان بولنے۔ لکھنے پڑھنے کی اُس میں پوری پوری قابلیت وصلاحیت آگئی ہے۔ جو روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہ زبان خاص کر اہلِ اسلام سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔

البتہ اِس بات کا ثبوت ہم کو ابھی تک نہیں ملا کہ داغ مرحوم آپ کے بقول زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنا رنگِ زبان بھی بدلتے گئے ہمارے نزدیک داغ نے اپنی پہلی ہی زبان قائم رکھی وعوج

پایا۔ جو معاملہ بندی۔ جو روز مرۂ دہلی۔ وہ ابتدا سے لکھتے آئے تھے۔ اُسی کو لکھتے چلے گئے۔ اور یہی اُنکی قدردانی کا باعث ہوا اگرچہ دہلی مٹ گئی مگر اُسکی زبان۔ اُس کے چوچلوں۔ اُس کے محاوروں اُنکے اندازِ کلام کو نہ مٹایا۔ نیچری شاعری کو اُنھوں نے پسند نہیں کیا۔ کوئی ناول یا ڈراما اُنھوں نے نہیں لکھا۔ کوئی سائنس۔ یا کسی اور علوم جدید کا پہلو اُنھوں نے اختیار نہیں کیا۔ پھر وہ کون سے زمانہ کی رفتار تھی جو اُنھوں نے اختیار کی۔ وہ تو ہمیشہ اپنے اُسی رنگ میں ڈوبے رہے۔ جس رنگ میں اُنہیں خدا داد ملکہ حاصل تھا۔ ہمارے وہ دوست تھے۔ فصیح اللغات میں اُنھوں نے ہماری فرہنگِ آصفیہ سے کچھ مدد لی۔ جسے مقابلہ کرکے دیکھئے۔ تقاضا کرکے ہم سے کتابیں منگوائیں۔ جب ہم حیدرآباد گئے تو ہر بار دعوتیں کھلائیں۔ اپنے قصیدوں کی داد چاہی اور فرمایا کہ لوگ کہتے تھے کہ داغ قصیدہ نہیں لکھ سکتا۔ دیکھئے خدا نے یہ مشکل بھی کیسی آسان کی۔ احکم الحاکمین نے اُنہیں دہلی کی زبان کا بادشاہ بنایا تھا۔ وہ اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ گو بعض سخن سنج یہ فرماتے ہیں کہ حضرتِ داغ رُباعی کے وزنوں کی پابندی سے آزاد رہے۔ مگر ان باتوں کو سخن فہم ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ بعض موقعوں پر اُنکا قدم رفتارِ زمانہ سے بھی کچھ آگے بڑھکر پڑا" جسکی نظیر کے واسطے ہمارا دل مثالی کے ساتھ منتظر ہے۔ داغ کا کلام سو برس کیا جب تک زبان اُردو کا نام باقی ہے۔ برابر قائم و برقرار رہیگا۔ وہ کونسی بات ہے کہ دہلی کے اور شاعروں نے جسکی طرف توجہ نہیں کی۔ وہی پرانی ترکیبیں اور دقیانوسی محاورے ہوتے۔ جن پرانے محاوروں کی سمجھ سے آدمی عاری ہوتا ہے وہاں ایسے ہی جُملے زبان سے سرزد ہوا کرتے ہیں۔ خواجہ **حالی** کی برکھارت۔ سیف الحق **ادیب** کی برکھارت۔ بدرالاسلام **شائق** کی برکھارت۔ دیکھئے کس زبان میں ہے۔ حضرتِ داغ کی ان رنگوں کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ ایک دفعہ منشی احسان اللہ **مخبر** اُن کے اُستاد بھائی کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ ہم کو اُن سے کمال محبت ہے اب کہاں ہیں اور کس رنگ میں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ رُڑکی میں ہیں مگر عاشقانہ شعرگوئی سے توبہ کرلی ہے۔ فرمایا بس تو اب ہم نے بھی یاری کُٹ کردی۔ اور سنو ایک دفعہ خواجہ حالی نے حضرتِ داغ کو لکھا کہ کیونکر گزرتی ہے اُنھوں نے اسکے جواب میں اپنی دو تازہ غزلیں بھیجیں اور سیّد وحید الدین احمد صاحب بیخود۔ حاضر الوقت سے یہ سطریں لکھوائیں "کہ بھائی میں تمام دن گھر کی گُنڈی لگائے اپنی زبان کی حفاظت کرتا رہتا ہوں" یعنی وہی قدیم انداز۔ وہی بندش۔ وہی دائرہ ہے اس سے باہر نکلنا منظور نہیں۔ اعتبار نہ آئے تو ان غزلوں کے رنگ کو دیکھ لو۔ اس بیان سے بھی یہی ظاہر ہے۔ کہ کوئی نیا رنگ اختیار نہیں کیا۔ جو اشعار مقبول آپکے کانوں کو مزہ دیں تعجب ہے

کہ اصلاحِ سخن میں انہیں الفاظ سے بھری غزلیں درج ہوتی رہتی ہیں۔ اور وہی پرانا عاشقانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ دہلی اہلِ کمال کہاں سے پیدا کرے۔ پیٹ کو ٹکیا نہیں سونے کو کھٹیا نہیں۔ اطمینان ہو تو سب کچھ کیا جائے۔ وہی مثل ہو رہی ہے کہ مُردے کو مجھٹہ کر دیا جاتا ہے اور روٹی کو ٹکڑے ہو کر۔ اگر یہ لوگ کچھ اپنے مادۂ خداداد سے کر کے بھی دکھائیں تو اپنا قدردان کہاں سے لائیں۔ خدا وہ دن کرے کہ **کلکتہ** کی بجائے دہلی دارالسلطنت ہو جائے یا لاہور کی لفٹنٹی یہاں آ جائے تو ہم دکھا دیں کہ یہاں کے اُجلی سمجھ والے کیا کچھ کر دکھاتے ہیں اور اب تو رات دن روٹی کے دھندے میں لگے رہتے ہیں بقولِ خواجہ میر درد ؎

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا ۔ یعنی کبھو تو اپنا بھی دل تھا دماغ تھا

لیکن اب بھی جو دو چار ٹوٹے پھوٹے دم ہیں۔ غنیمت ہیں۔ بلکہ چھوٹی تانتی بھی جودتِ طبع۔ رسائی دماغ۔ بلند پروازی خیالات میں اپنی آن بان دکھاتی رہتی ہے۔ اگر روزانہ **پیسہ اخبار** وغیرہ کا یہاں اسی طرح شوق رہا۔ تو ان کے مطالعہ سے روز بروز علمی مذاق بھی بڑھتا جائیگا۔ اتنا تو ہو گیا ہے کہ جو لوگ بازار سے خرید کر پڑھنے کا مقدور نہیں رکھتے تو وہ دہلی پبلک لائبریری میں ضرور جا کر پڑھ آتے ہیں۔ **تجارتی منڈی** کے جو دھنی ہیں انہوں نے بھی قومی مدرسے کھول دئے جہاں سے تجارتی کاروبار اور ابتدائی تعلیم کی پلٹنیں نکلنی شروع ہو گئی ہیں۔ کوئی وکالت پر گرا ہے تو کوئی تجارتی مشغلہ پر باقاعدہ ڈھلا ہے۔ مضمون نگاری۔ انشاپردازی۔ مدرسی۔ ماسٹری میں بھی قدم رکھنے لگے ہیں۔ کوئی دن جاتا ہے کہ دہلی کے **پنجابی** تاجر ہر فن مولا ہو جائیں گے۔ اصلاحِ قوم۔ اصلاحِ رسوم۔ درستیٔ اخلاق پر بھی ٹوٹ پڑے ہیں۔ دہلی کا نام رکھ لینے والے اگر ہیں تو اب یہی اصحاب ہیں۔ آسودگی نے سخاوت کا ڈنکہ بھی انہیں کے نام کا بجوا دیا ہے۔ مگر بعض بعض سخاوتیں ایسی ہیں کہ وہ لوگوں کو رہا سہا سُست۔ کاہل اور مجہول بنائے دیتی ہیں۔ حرفت۔ پیشہ۔ مزدوری۔ ملازمت چھوڑ چھوڑ کر مردوں اور عورتوں نے بھیک مانگنے پر کمر باندھ لی ہے۔ زکوٰۃ سے۔ صدقہ سے۔ فطرہ سے۔ قربانی سے۔ مالِ میت سے۔ فاتحہ درود کے لوازمات سے۔ حج کے نام سے لوگوں کو برابر مدد پہنچ رہی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سخاوت نہیں اہلِ اسلام کے ساتھ عین عداوت ہے۔ جن لوگوں کو گھر بیٹھے بلا محنت و مشقت روٹی ملے۔ وہ کیونکر کوئی ایجاد یا اختراع رفعِ ضرورت کے واسطے بروئے کار لا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک ایجاد و اختراع کی رہنما ضرورت ہے۔ جب احتیاج کی ضرورت نہ رہی تو کیوں کوئی فن نکالا یا علم ایجاد کیا جائے۔ **یونان** بھیک کو عیب نہ سمجھنے سے اپنے کاروبار چھوڑ کر ایک مرتبہ تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ اب **ہندوستان** کی باری ہے

اِس میں کیا کلام ہے۔ کہ آگرہ اور اودھ کے بعد **پنجاب۔ دکن**۔ اور **بہار** نے اُردو زبان کی بہت کچھ خدمت کی ہے۔ خان بہادر مولوی سیّد علی محمد صاحب شاؔد۔ مولوی فضل حق صاحب آزاؔد۔ حکیم سیّد نہیم الدین صاحب فہیمؔ عظیم آبادی۔ مولوی حبیب الرحمان صاحب مونگیری۔ مولوی ابو العاص صاحب ہوسؔ عظیم آبادی۔ ان سب روشن سیاروں کے آفتاب مولوی قاری مولانا شاہ **سلیمان** صاحب پیرزادہ پھلواری کیسے مُقدّس۔ خوش بیان۔ خوش تقریر قابل فخر نہ گوا ہیں مگر میرٹھ بھی کچھ کم نہیں ہے پنجاب کی ترقی کو ہم دل سے مانتے اور سراہتے ہیں۔ لیکن دکن پر ترجیح نہیں دے سکتے لٹریری ذخیرہ تیّار ہونے میں جس وجہ سے قدرے کمی ہوئی وہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ مگر اصلاح سخن کے مطلب کی فوج ہمیشہ تیّار ہے۔ یعنی ابھی تک دہلی شعراے گرامی قدر سے خالی نہیں ہے گو اھل لکھنؤ کی طرح یہاں ذرا ذرا سی بات پر دُھوم مچا دینے کی عادت نہیں۔ لیکن ملکہ خداداد طبع وقار۔ رسائی طبع۔ لطافت زبان اُن کے گھر کی لونڈی ہے۔ بچہ بچہ بلحاظ زبان۔ ذوق۔ میر۔ داغ۔ غالب مومن بنا ہوا ہے۔ ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یعنی جو اُن کا خمیر تھا وہی انکا خمیر ہے۔ جس باغ کے وہ گل بوٹے تھے۔ اُسی باغ کے یہ غنچے اور کلیاں ہیں پشت پناہ سخن اردوے عالی جناب سیّد ظہیر الدین[۵] حسین صاحب **ظہیر** دہلوی کا دلولہ انگیز نزاکت آمیز کلام سنو اور انہیں ملجا و ماواے سخن بے چون وچرا نہ مانو تو ہم اپنا کان پکڑیں۔ سیّد وحید الدین احمد صاحب **بیخود** کا کلام سُنکر بیخود نہ ہو جاؤ تو ہم ہارے تم جیتے۔ منشی کرم اللہ خانصاحب **شیدا** کے کلام پر فریفتہ ہو کر نہ مر مٹو تو ہمارا ذمہ۔ حضرت مولوی عبد الرحیم خانصاحب **بیدل** کی فصاحت اور روزمرّہ تمہارا دل نہ چھین لے اور دل پکڑے پکڑے نہ پھرو تو ہم جھوٹے تم سچے۔ نواب احمد سعید خانصاحب **طالب** کے اشعار سنو تو شاگردی کے طالب ہو جاؤ۔ نواب سراج الدین احمد خانصاحب **سائل** کی نغمہ سنجی پر کان لگاؤ تو فقیر بن جاؤ۔ آغا صاحب **شاعر** کی بلند پروازی دیکھو تو انہیں آقاے سخن سمجھنے میں تامل نہ کرو۔ علی ہذا القیاس ان سے آگے چلو تو منشی بہاری لال صاحب **مشتاق** کے پیارے کلام کے ہمیشہ مشتاق رہو۔ منشی قمر الدین صاحب **قمر** کے لئے چکور بنکر آسمان کے چکر کاٹتے پھرو۔ بابو مہاراج بہادر **برق** کے دھواں دھار اشعار کی برق اندازی پر نظر ڈالو اگر زمین پر لوٹے لوٹے نہ پھرو تو اس سمجھ پر بجلی ٹوٹے۔ مرزا تقی بیگ بیگ صاحب **شیدا** کے کلام پر شیدا و والہ بنو۔ منشی سورج نراین صاحب **مہر** کی مُوشگافیانہ وموحدانہ جلوہ افروزیوں سے آنکھ لڑاؤ اور چکا چوند سے سورج مکھی نہ بنجاؤ یا انکے نراین کی شکتی کو نہ مانو تو ہمیں مات دو۔ محمد مرزا خاں صاحب **عابد** کے لئے معبود کی قدرت دیکھکر سر بسجود نہو جاؤ تو ہمیں

[۵] افسوس کہ سال میں بمقام حیدرآباد دکن انتقال فرمایا

عبادت کا سُنکر سمجھو۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب **کیفی** کے سُرور افزا اشعار سُنکر مسرور نہو تو ہمارے دعوے کو بے بنیاد ٹھیراؤ۔ حکیم اسد علی خاں صاحب **مضطر** کا کلام آپکو مضطرب و بیقرار نہ بنائے تو جو کچھ تم سے کہا جائے ہمیں کہلو۔ منشی گوری شنکر صاحب **قصیر** کے کثیر المعانی اور قصیر التعداد و شاعرانہ الفاظ و وفادارانہ مضامین کو دیکھو اور یونہیں نہ بجاؤ تو ہمیں قصوروار ٹھیراؤ۔ نواب سید اکبر مرزا صاحب **سیّد** کا کلام سُنو اور سادات کرشمہ کے معتقد نہ ہو یا اُنہیں کُل شعرا کا سردار باوقار نہ مانو تو بیشک ہمیں قائل کرو۔ مرزا خورشید عالم بہادر گورگانی **خورشید** کے اشعار کا کبھی جلال کبھی جمال دیکھو اور آفتاب پرستی پر نہ اُتر پڑو تو بے شک ہمیں شمّاسی خیال کرو۔ اسی طرح اگر **ضیا**ء گورگانی کے کلام کی نور افزا شعاع تار برقی کی طرح رگ رگ میں سرایت کر کے نورانی جلوہ نہ دکھادے تو ہمیں معدوم البصر جانو۔ محمد تقی بیگ **مائل** کے لئے بصدق دل مائل ہو اور آکر اُن کا کلام سُنو تو قلعی کھُلے۔

بے شک یہ لوگ شہرت طلب نہیں ہیں۔ یہ اپنی شہرت کو تشہیر اور اس قسم کی ناموری کو عین تحقیر سمجھتے ہیں مگر کوئی شائق آجائے۔ اِن کا کلام سُننے یا سُنکر لیجائے تو اسمیں دریغ بھی نہیں فرماتے۔ یہ بھی ایک مرکزی ثبوت ہے۔

یہ بات تامّل طلب ہے کہ "دہلی یا لکھنؤ کے بعض محاورے پُرانے ہو گئے اُنکو قابل استعمال نہیں سمجھتے" یوں تو ہر ایک زبان غیر مانوس الفاظ کو چھوڑتی اور مانُوس کو اختیار کرتی جاتی ہے اور یہی حال دہلی کا بھی قیاس میں آسکتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو قابل استعمال نہیں سمجھتے۔ اگر اہل دہلی ہیں تو یہ بات قابل اعتراض نہیں وہ حکّ و اصلاح کے مجاز ہیں جو کچھ کریں گے اپنی زبان اور رُجحان کے موافق کریں گے اگر باہر والے ہیں جن کی جہالت سے خدا نکالے اور اُن کے بے میل۔ بے جوڑ الفاظ سے پالا نہ ڈالے تو یہ بات قابل تسلیم نہیں۔ اس کے علاوہ بعض کا اطلاق کُل یا کثرت پر نہیں ہوسکتا۔ جزو کی خاطر کُل کو چھوڑنا انصاف کے برخلاف ہے۔

ایک پنجاب کے اخبار دنیر کیا موقوف ہے جہاں کے اخباروں میں کوئی بات چھپیگی وہ سب میں مشتہر ہوجائیگی لگر وہ اخبار کثیر الاشاعت نہیں ہیں اور وہ بات اِس قابل ہے کہ اُس سے عام لوگوں کو باخبر کیا جائے تو کثیر الاشاعت اخبار خود اُسے اپنے اخباروں میں جگہ دیں گے اور اگر جگہ نہ دیں گے تو پبلک کے گناہگار ٹھیرینگے۔ اسمیں علمی زبان ہو یا لٹریری۔ مگر علمی زبان آپ کس کو کہتے ہیں۔ اگر علم سے غرض فنون طبیعات۔ سائنس۔ ریاضی وغیرہ ہے۔ تو ہر علم کی اصطلاحیں مخصوص ہوا کرتی ہیں۔ اور وہ اُسی علم میں کام آمد ہوتی ہیں جس علم سے متعلق ہیں۔ نہ کہ خواہ مخواہ ہر ایک موقع پر دخل در معقولات سے کام

لیں اور کھینچ تان کر بلا مناسبت ہر ایک جگہ پر لے آئیں۔
رَو۔ آپ جانتے ہیں کہ پانی کے ریلے کو کہتے ہیں۔ مگر طبیعات۔ یا سائنس کے ترجمہ میں بجلی کی دوڑتی ہوئی قوت یا شعلہ کو برقی رَو لکھا گیا ہے۔ تو کیا ضرور ہے کہ ہم یہاں اس رَو کو بھی پانی کی رَو سمجھیں۔ یا اپنے سابقہ روزمرّہ کے موافق پانی کے ریلے کی بجائے برقی رو خیال کریں۔
مثبت اور منفی دراصل گریمر یا منطقی اصطلاحیں تھیں۔ لیکن سائنس کے ترجمہ میں بجلی کی تقسیم سے مُراد لی ہے (یعنی قائم و منفی بجلی) تو کیا لازم ہے کہ ہم سائنس میں بھی منطق و صرف و نحو کی مجوزہ اصطلاح سے کام لیں۔ اور وُہی بجلی کی اصطلاحی تقسیم برقرار رکھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو اصطلاح جس علم میں بیان ہوئی ہے۔ وہ اُسی علم کے متعلق مفہوم ہوگی۔ نہ کہ دیگر علوم سے بھی ویسا ہی تعلق رکھے گی۔
دائرہ کی تعریف جو اقلیدس میں ہے کیا اُس کے لئے ہم چکر۔ کنڈل۔ منڈل۔ گھیرا۔ گتا۔ گروہ۔ پتہ قرص۔ چکّی۔ حلقہ۔ کُنڈلی۔ وغیرہ اقلیدس کی تعریف کے برخلاف ہر ایک جگہ مستعمل کر سکتے ہیں؟ کیا کُرہ کے واسطے گولا۔ یا گیند کا لفظ خاص اصطلاح کو چھوڑ کر برتاؤ میں لا سکتے ہیں؟ کیا قوس کی مخصوص تعریف سے گزر کر اُسے دَھنک۔ دھنش۔ یا کمان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پس علمی زبان اور ہے اور روزمرّہ بول چال یا علمِ ادب اور کوئی سا علم کیوں نہ ہو۔ اُردو زبان میں آسکتا ہے۔ اسکا میدان وسیع ہے۔ ہندی کے الفاظ۔ سنسکرت کے الفاظ۔ عربی کے الفاظ۔ فارسی کے الفاظ۔ گریک یا لیٹن کے الفاظ۔ ترکی الفاظ۔ انگریزی کے الفاظ۔ جون سے چاہو اسمیں کھپا سکتے ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جہانتک ہندی۔ فارسی۔ عربی کے الفاظ مل سکیں۔ اُنہیں مُقدّم سمجھیں۔ اور باقی اصطلاحیں خواہ مرکب کرکے خواہ مفردات میں قائم رکھی جائیں۔ اُردو زبان میں جو ناول۔ تاریخیں۔ الجبرا۔ اُقلیدس۔ مساحت۔ ریاضی کا ترجمہ ہوا ہے۔ کیا اُس کے لئے الفاظ میسّر نہیں آئے۔ اگر نہیں آئے تو یہ اتنے بڑے بڑے ترجمے کہاں سے کئے گئے۔
ہمارے ایک دوست نے صوبۂ بہار کی تعلیمی کتابوں کے واسطے کچھ ٹھیٹ ہندی الفاظ گھڑے تھے۔ مثلاً ادھ چکر نصف دائرہ کے واسطے پورا چکر پورے دائرے کے لئے۔ لیکن پہلے ترجموں میں جو عربی الفاظ مستعمل ہوگئے تھے۔ اُن کے آگے یہ سمجھ میں ہی نہیں آئے۔
اِسی طرح راجہ شیو پرشاد صاحب نے جو اُردو صرف و نحو نام رکھکر ٹھیٹ سنسکرت اصطلاحات کا اُسمیں نمونہ دکھایا۔ وہ بھی پانی کے بُلبلے کی طرح اُبھر کر رہ گئی۔ اُردو تو اُردو ہندی خوانوں کو بھی اُسکا سمجھنا اور اُس پر عمل درآمد کرنا مشکل ہوگیا کسی نے بھی نہ جانا کہ سارتھک کیا ہے۔ اور نرتھک کس جانور کا نام ہے۔ ہاں موضوع اور مہمل سب نے سمجھ لیا۔ سو بھاوِک دھات اور کرترم کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

مصدرِ وضعی و غیر وضعی آسانی سے ذہن نشین ہوگیا۔ شتق کی بجائے **وصانج**۔ لازم کی بجائے اکرمک۔ نکرہ کی بجائے جاتِ باچک وغیرہ الفاظ کا رواج جاہا گر نہ ہوا۔ اُستاد نے ماضی کی بجائے بھوت سمجھایا۔ طالب علم اُسے پریت اور بھتنا سمجھے۔ جس سے ثابت ہوا کہ اردو میں مُغلق اور ثقیل المخارج الفاظ کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ اُسکی فصاحت ایسے الفاظ اخذ کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ وہ تو عام فہم اور سہل المخارج کی دلدادہ ہے اور یہی مقبولیتِ عام کی وجہ ہے۔ اگر **بدھ مذہب** سنسکرت زبان میں اپنی انمول نصیحتوں کو بیان کرتا تو اس قدر ترقی نہ ہوتی جس قدر **پراکرت** یعنی عام زبان میں اسکی ہدایات نے رواج پاکر دلنشینی وخاطر گزینی کا مرتبہ حاصل کیا۔ یہی حال خاص اردوئے معلّےٰ یعنی دہلی کی مقبولِ عام زبان کا ہے نہ کہ لکھنؤ کی زبان کا کہ فقرے کے فقرے اگر ان میں سے چند ہندی روابط و افعال نکال دئے جائیں۔ تو خاصی فارسی کی عبارت بنتی چلی جائے۔ اب فرمائیے انوکھے محاورے یہ ہیں جنکا ہم نے ذکر کیا۔ یا جان چھڑکنا اور بھول پڑجانا جن کے سمجھنے میں آپ نے خود غلطی کی اور بہت بڑی غلطی کی۔ دہلی کی زبان کا مرکز تو کیا؟ ہاں لکھنؤ کی زبان کا مرکز لاہور ہوسکتا ہے۔ کیونکہ دو نو مقلد ہیں؛

آپ نے یہ کیونکر جانا کہ **عربی** نے اپنا پرانا وطن چھوڑ دیا۔ کیا وہاں اب یہ زبان بالکل نہیں بولی جاتی یا مستند نہیں رہی یہ فرمائیے چونکہ وہ اسلامی مرکز تھا وہاں کا وہیں بنا رہا۔ مگر اُس کی زبان جو سلاست و فصاحت میں اپنا جواب نہیں رکھتی یہاں تک پھیلی کہ **بیروت** اور **مصر** میں جا پہنچی۔ اور ایسی مقبول ہوئی کہ عربی میں یہودی۔ نصرانی۔ قبطی۔ الجیرین۔ ابیسینین۔ اہلِ مراکو۔ اہلِ نوبہ وغیرہ نے صرف یہ زبان ہی اختیار نہیں کی بلکہ اس زبان میں تصنیفات کے ڈھیر لگادئے۔ اخبار جاری کردئے۔ اور اسقدر ترقی کی کہ جرمنی۔ فرانس۔ اور انگلستان میں بھی اسکے فاضل نظر آنے لگے۔ لین صاحب کی مدّ القاموس[۱] آپنے دیکھی ہوگی۔ جنہوں نے خاص عرب میں رہکر جمع کی اور انگلستان میں آکر شاید بیس جلدوں میں چھپوائی۔ اہلِ عرب کو فخر کرنا چاہیئے کہ انکی زبان زندہ زبانوں میں ہے ٹوٹی لنگڑی میں نہیں ہے۔ اُس نے یہانتک ترقی کی ہے کہ غیر قوموں اور غیر ملکوں میں بھی دوڑ گئی ہے عرب جو سب پوچھتے ہیں۔ اور جب تک مذہبِ اسلام اور خدا کا کلام قائم رہیگا۔ برابر پوچھے جائینگے۔ آپ جو بیروت اور مصر کو عربی کے حق میں قابلِ سند گردانتے ہیں کیا حلِّ لغاتِ قرآن و احادیث میں بھی بیروتی یا مصری عربی سند لی جاتی ہے؛ جسکا نام ٹھیٹ اردو زبان ہے وہ دہلی سے نکلکر اپنی اصلی حالت کے ساتھ لاہور نہیں چلی جائیگی۔ بلکہ لاہور والے خود دہلی کی زبان کے متبع ہیں اور ہونے

[۱] اسکی حرف قاف تک کی جلدیں ہماری نظر سے بھی گزریں

چلے جائینگے۔ یہی دہلی کے واسطے مرکزی ثبوت اور اُردو کی ترقی کا پورا پورا معیار ہے۔ جس زبان میں اپنے مقام پیدائش کی اصالت و شستگی۔ مختلف قسم کی تصانیف کا مادہ ہوتا ہے۔ اسمیں ہر ایک علم جگہ پاتا چلا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں جس طرح علومِ قدیمہ کا ذخیرہ موجود ہے۔ اسی طرح علومِ جدیدہ کا اندراج بھی ہو رہا ہے اور روز بروز ہوتا رہیگا۔ **دیوناگری** کا دیو کیا بڑے سے بڑا ناگ بھی حملہ کرکے اپنا زہریلا اثر اس پر نہیں پہنچا سکتا۔ کالے سے وہ ڈرے جس کے پاس اُس کے کاٹے کا منتر نہ ہو۔

۱۸۷۶ء کا ذکر ہے کہ **صوبہ بہار** میں ایک دفعہ یہ ہلہلہ اُٹھا کہ فارسی حروف کی بجائے کائیتی ہندی حرفوں میں حکماً عدالتی کارروائی کیجائے گی۔ چنانچہ اس پر عمل درآمد ہونے لگا۔ مسلمان گھبرا اُٹھے کہ اب ہمیں نہ تو روزگار ملیگا اور نہ ہماری یہ زبان رہیگی۔ ہم بھی اتفاق سے داناپور میں موجود تھے۔ بہتیرے مسلمانوں نے ہندی سیکھنی شروع کردی اور بہتیرے روزگار چھوڑ دینے پر مستعد ہوگئے۔ باوجودیکہ وہاں کی عدالتوں میں ہندی حروف کا رواج ہو گیا۔ اور شاید صوبہ بہار کا گورنمنٹ گزٹ بھی اُسی میں چھپنے لگا۔ مگر وہاں کی جو اُردو زبان تھی وہ آجتک نہ مٹی۔ اٹھائیس برس ہوگئے۔ وہی شاعری کا چرچا۔ وہی تصنیف کا ذوق شوق۔ وہی زبان کی تراش خراش بنی رہی یہانتک کہ آپ کی قلم سے بھی یہی نکلا کہ "آگرہ اور اودھ کے بعد پنجاب۔ دکن اور بہار کا نمبر ہے۔ جہاں اُردو نے غیر معمولی ترقی کی ہے" جب بہار میں اُردو زبان کی بیخ کنی نہ ہوسکی تو صوبجاتِ متحدہ میں اور خاصکر پنجاب میں کیونکر ہوسکتی ہے۔ گو **صوبجات متحدہ** میں ناگری حروف عدالتی کارروائی کیواسطے مختص ہوگئے **گوالیار** میں مرہٹی وناگری حروف میں لکھے جانے کی پخ لگ گئی۔ مگر زبان وہی رہی اور رہیگی۔ **پٹیالہ** میں گرمکھی کا رواج دیا گیا۔ تو کیا واں کے لوگوں کی زبان کٹ گئی۔ اسیطرح اگر بفرض محال تمام پنجاب میں گرمکھی حروف اور پنجابی زبان کا سررشتۂ تعلیم میں رواج دیا جائے گا تو کیا اردو زبان سلب و مفقود ہو جائے گی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ ایک ایک کے گھٹ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ دلوں میں اُتر گئی ہے۔ رگ وپے میں پیوست ہوگئی ہے اس کے الفاظ ملائے بغیر چارہ ہی نہیں۔ قانونی اصطلاحیں۔ علمی الفاظ اس میں سے نکلنے مشکل اور بامشکل ہیں۔ پہلے قانونی اصطلاحوں کو بدلو۔ عام ملکی مذاق کو چھوڑو۔ سررشتۂ تعلیم کے ذخیرہ کا دیوالہ نکالو جب زبان پر یہ لفظ لاؤ کہ ہماری ہندوستانی زبان جسکی اردو زبان ایک دوسری شان ہے ترقی سے گر کر تنزل کے راستے پر پڑنے لگی۔ کوئی زبان جب تک اُس کے بولنے والے زندہ رہتے اور بازار کے سودا سلف

رسوم مروّجہ کا اُس سے کام پڑتا رہتا ہے کبھی نہیں مرتی۔ ممالکِ متحدہ میں جس قسم کی تصنیفات کی جب ترقّی تھی اُسی قسم کی اب ہے وُہی ناول نگاری۔ وُہی انشاپردازی وُہی شاعری بایتک برابر رسوم مچارہی ہے۔

یہ شور مچاناکہ ہائے! اُردو چلی! ہائے! اُردو چلی! ہماری زبان کی اُلٹی کمزوری ثابت کرتا ہے حالانکہ ہم مخالفوں کی زبان اسکی روزمرہ نمایاں ترقّی اورحالتِ موجودہ سے کیل سکتے ہیں۔ لیڈروں کا منہ بند کرسکتے ہیں۔ گورنمنٹ مانے یا نہ مانے۔ رؤسا ہند ساتھ دیں یا نہ دیں۔ اُردو زبان نے وہ ہردلعزیزی اور عمومیت پیدا کرلی ہے۔ کہ یہ مٹی ہے نہ مٹیگی۔ ریلوں میں بیٹھکر۔ جہازوں پر سوار ہوکر۔ ملک در ملک پھر کر دیکھ لو۔ کہاں کہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پھر گھبرانے اور تلملانے سے کیا فائدہ۔ اہل اسلام کی یہ گھر کتّی کی بولی ہے۔ اور صاحبانِ ہنود کی تسلیم وپسند کردہ۔ ملکی۔ عام۔ مہذب۔ درباری اور علمی زبان ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے۔ تو اس قدر اور اس کثرت سے صاحبانِ ہنود میں شاعر۔ انشاپرداز۔ ناول نگار۔ مصنّف۔ مترجم کیوں ہیں۔ اُردو میں صاحبانِ ہنود۔ اخبار۔ رسالے۔ کیوں نکال رہے ہیں اگر وہ ضدّم ضدّا میں آکر ٹھیٹ ہندی کا استعمال بھی کرنا چاہتے ہیں تو کوئی سطر۔ کوئی عبارت تمہاری اِس زبان اور اُس کے الفاظ سے خالی نہیں پائی جاتی۔ گو غرض کی جگہ گرج۔ عرض کی جگہ ارج۔ قرض کی جگہ کرج۔ غریب نواز کی جگہ گریب نواج۔ عقل کی جگہ اَکل۔ بادشاہ کی جگہ باچھا۔ حضور کی جگہ ہجور۔ حضرت کی جگہ ہجرت۔ فرمان کی جگہ پھرمان۔ حکم کی جگہ ہکم۔ پیغام کی جگہ پیگام۔ غافل کی جگہ گافل۔ باتوں کی جگہ باتاں۔ تکلیفوں کی جگہ تکلیفاں۔ شرابوں کی جگہ شراباں۔ قلموں کی جگہ قلماں۔ گھاتوں کی جگہ گھاتاں۔ انگریزوں کی جگہ انگریجوں۔ لکھدیں۔ مگر کہنے میں یہی آئیگا کہ اُردو کا منہ چڑاتا ہے۔ اُسکے الفاظ کو بگاڑا نہیں بلکہ سنوارنے کیطرف توجہ دلائی ہے۔

ہم اس بات کے بالکل خلاف ہیں کہ اُردو کیواسطے آل انڈیا کانفرنس۔ انجمن حامیٔ اُردو۔ انجمن ترقّی اُردو قائم کیجائیں۔ اور اُن سے یہ بات حاصل ہوجائے کہ آپکی اُردو کو چھوڑنیوالے بھی آپکے ساتھی بنجائیں۔ ترقّی دینے کی یہ صورتیں نہیں ہیں یہ تو نری دکھاوے کی ہے ترقّی کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اُس میں جس بات کی کمی ہو اُسے پُورا کردو اور اسطرح پورا کرو جسطرح کوئی موجد یا کوئی صنّاع اپنی صنعت یا ایجاد میں ایک نیا ایک ایسی نئی بات نکالدیتا ہے کہ اُس سے پیشتر کی چیزیں گرد ہوکر بیٹھ جاتی ہیں اور اسکا ایجاد اسکی نئی چیز کو لے اُڑتا ہے۔ سب اِسی طرف از خود ٹوٹ پڑتے ہیں۔ نہ کہ واویلا کرکے کسی چیز کو کسی کے سر ڈالنا۔ اور تجربہ کے برخلاف زبانی تعریف سے یقین دلانا۔ یہ تو ایک دھینگا دھینگی ہوئی نہ کہ ترقی۔

اگر اُردو میں کوئی وصف ہے تو وہ منکروں کو اپنا مقر بنائے گی غیر قوموں کے مصنّفوں کو اپنا ساتھی کرلے گی۔ عدالتی کارروائیوں کو اس زبان کا گرویدہ بنالیگی۔ اور جو وہ اپنے ذاتی جوہر۔ ذاتی وصف سے خالی ہے

تو یہ غل شور اور اس قدر شور اشوری اپنی آپ ٹھیپڑی پٹوائیگی۔ اس سے پارٹی فیلنگ کا مسئلہ ثابت ہو جائیگا اور یہی ہمارے حق میں گورنمنٹ کی طرف سے مُضر پڑیگا۔ تم کسی کو ترغیب نہ دو۔ کسی کو ساتھی نہ بناؤ۔ خود آپ چشمۂ شیریں بنو اور سب کو اپنی طرف کھینچ بلاؤ۔ بلکہ سمجھ لو کہ ناگری کے ڈراؤنے حملے ہمارا کچھ نہیں کرسکتے۔ جو تیر از دست رفتہ ہے اُسے کوئی پکڑ کر نہیں لا سکتا۔ جو بات طشت از بام ہو گئی جس کو ایک ایک شخص نے جان لیا۔ وہ کبھی قابو میں نہیں آسکتی۔ عدالت لوگوں کو منع نہیں کرسکتی کہ اپنے گھروں میں اُردو نہ بولو۔ شاہی دربار کسی زبان کو اُسکے بولنے والوں۔ شہروں اور گانوگنوؤں کے رہنے والوں میں سے کبھی نہیں نکال سکتا۔ کہ یہ درباری زبان نہیں ہے۔ اِسے نہ بولو۔ سررشتۂ تعلیم یہ نہیں کرسکتا کہ اگر وہ اِسکو ملکی یا علمی زبان قرار نہ دے یا لازمی نہ گردانے تو تمہارے ملک سے بھی یہ زبان خارج البلد ہو جائے۔ جس حالت میں ہر ایک فرقہ کی خاص خاص بولی نہیں بند کی جاسکتی تو اتنی بڑی بولی جو ہندوستان کے ایک بڑے احاطہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اُسکے بولنے والوں میں سے اگر صرف ایک ہی فرقہ کو لیا جائے تو چھ **سات کروڑ**۔ اور بصورتِ دیگر دس بارہ کروڑ اہلِ ہند اُردو زبان بولتے ہیں پھر کیونکر خارج از ملک ہو سکتی ہے۔ ہاں سب کی ایک سرے سے زبانیں نکال لی جائیں۔ اور صرف اشاروں پر کاروبار آن ٹھیرے تو ممکن ہے۔ لیکن غیر ملکوں سے اخراج کرنا پھر بھی ناممکن و دشوار ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اہلِ پنجاب کو خاص احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ اِن کے ہاتھ میں کثیر الاشاعت اخبار و رسائل ہیں۔ جو بات مُنہ سے نکالیں غور سے دیکھ لیا کریں۔ کہ اُسمیں لفظی یا معنوی سُقم تو نہیں ہے" یہ بات نہایت بودی اور اوچھی ہے اور آپ کے مرکزی دعوے و امید کو زور کے ساتھ توڑتی ہے۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ غلُ غپاڑا کہ آپکی زبان اُردو زبان ہے محض ایک دل لگی اور اوپری دل سے دعوے ہے ورنہ اس قول کے موافق آپکی اُردو میں ہر قسم کے سینکڑوں نقص موجود ہیں۔ میں اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کرتا کہ لاہور کی اُردو میں اس قدر نقص ہیں۔ میرے نزدیک وہ ایسے عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔ اُس کے اُردو اخباروں نے دہلی کے برائے نام اُردو اخباروں کو پرے بٹھا دیا ہے۔ اہلِ لاہور کی زبان میں اگر فرق ہے تو صرف اتنا جتنا کہ اہلِ زبان اور مقلدِ زبان میں ہوا کرتا ہے۔ پنجاب کے سررشتۂ تعلیم میں سب سے زیادہ پنجاب یا تعلیم یافتہ اہالیانِ لاہور نے حصہ لے رکھا ہے۔ اُن کا ترجمہ نہایت صاف اور قابلِ گرفت عیوب سے مبّرا ہوتا ہے۔ حمایت الاسلام کی کتابیں دیکھو۔ انشاء اللہ خاں صاحب مالکِ وطن کے مضامین پڑھو۔ پیسہ اخبار کے ایڈیٹوریل یا ریڈنگ آرٹیکل مطالعہ کرو۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی نظم جنکی مسلم اُستادی کا سب کو خیال ہے استماع فرماؤ۔

خان احمد حسین خاں صاحب احمد۔ بی۔ اے کی عاشقانہ غزلیں نعتیہ اشعار اور ناولوں کی بھرمار گوش زد فرماؤ۔ پروفیسر خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے کا جنہیں شعرائے پنجاب کا دل کہنا چاہئیے پاکیزہ کلام ملاحظہ فرماؤ۔ رسالۂ مخزن پر نظر ڈالو۔ علیٰ ہذا مولوی ظفر علیخان صاحب بی۔ اے۔ اڈیٹر اخبار زمیندار کی لیاقت۔ تصانیف تراجم اُردو بول چال نو ورد ار مضامین اور نظموں کو دیکھو کس دھڑلے کی نظمیں اور مضمون ہیں کہ بڑے بڑے قابل عش عش کرتے ہیں کوئی کہ سکتا ہے کہ اِنمیں کچھ عیب ہے ؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ رہے خاص خاص محاورے اُن کی بات دوسری ہے۔ اُن میں کون نہیں چوُکتا۔ لیکن یہ چوُک زبان کے امتحان میں بحالتِ مجموعی فیل نہیں کر سکتی۔ پاس ایبل نمبر دلاہی دیتی ہے اِس سے آگے جو کچھ آپنے لکھا ہے وہ اِسکا نقیض ہے بیشک اِسمیں ہمیں اتّفاق ہے کہ ہر اُردو زبان کی قابلیت رکھنے والا کسی ملک۔ کسی شہر۔ کسی قوم۔ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو وہ قابلِ قدر اور واجب التعظیم ہے ہمارا اسمیں تعصب کو راہ دینا گویا انصاف کا خون کرنا اور اہلِ جوہر کی ترقّی کو مٹانا ہے۔ آپکی یہ رائے بھی قرینِ قیاس ہے کہ اگر کوئی مسئلہ متنازعہ فیہ یا رائے طلب ہو تو کسی لیٹریری رسالہ میں پیش کر کے طے کر لیا جائے۔ مگر یہ بالکل ناواجب ہے کہ دہلی اور لکھنٔو کو بائیکاٹ کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک زبان کے متعلق اہلِ زبان کی شرکت نہ ہو۔ وہ فیصلہ انقطاعی یا حتمی قرار نہیں پا سکتا۔ اہلِ زبان کی انانیت اوّل تو سرے سے اپنی سمجھ کی غلطی ہے اور اگر بالفرض ہے تو اُسکی پروا نہ کیجائے۔ اُن سے موافق یا ناموافق جواب ضرور لیا جائے۔ جن وجوہ سے وہ فیصلہ کرینگے مُقلّد بجز اِسکے کہ اساتذہ کے کلام۔ اساتذہ کی تصانیف کو جسمیں کاتبوں کی طرف سے غلطیوں کا ہوجانا ممکن ہے۔ پیش نظر رکھکر سندیں لائیں اور جواب دیں۔ اِس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اِسکے علاوہ اُن کی موجودہ زبان نے جو تبدیلیاں کی ہونگی اُنہیں بھی دیگر امصار کے اہلِ قلم نہیں دیکھ سکیں گے۔ ایران کی پہلی اور اب کی زبان ہی کو دیکھ لو۔ سفرنامۂ شاہِ ایران ہی کو پڑھ لو۔ کس قدر فرق ہو گیا ہے یہی حال دہلی اور لکھنٔو کی زبان کا سمجھ لینا چاہئیے ؛

کوئی کیسا ہی دعوے کرے۔ کبھی نہیں دکھا سکتا کہ اہلِ زبان مُقلّدِ زبان کے کلام یا مُحاورے کا اتّباع کریگا۔ اُس کے کان۔ اُس کا لب و لہجہ۔ اُس کی زبان کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ پوربی بھاکا یا پنجابی آمیز اُردو سے سند لے۔ وہ اپنے شہر کے ناخواندہ بچّہ کو زبان کے فیصلہ کے واسطے پسند کر لیگا۔ مگر مُقلّدِ زبان کی بات کو ہرگز ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔ اہلِ **انگلینڈ** اہلِ آیرلینڈ کی زبان کو کیوں اپنی زبان پر ترجیح نہیں دیتے ؟ کیا آیرلینڈ میں بڑے بڑے فاضل۔

بڑے بڑے مصنف۔ بڑے بڑے انشا پرداز۔ ناول نگار موجود نہیں ہیں۔ ؟ امریکہ کی زبان انگلش کو اہلِ انگلستان کیوں مستند نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اصلاً نسلاً ایک ہی جگہ ایک ہی نسل اور ایک ہی زبان کے بولنے والے ہیں

ہم ہر ایک قابل کی قدر کرینگے۔ اُردو کی خدمت۔ اُردو کی دلسوزی کرنے والے کو اپنا دلی دوست۔ اپنا دلی ہمدرد اور خیر خواہ سمجھیں گے۔ خواہ وہ کسی ملک کسی شہر اور کسی مذہب یا فرقہ کا کیوں نہ ہو مگر قبلہ! یہ نہیں ہو سکتا کہ اُسے اہلِ زبان اپنی زبان کے کسی فیصلہ کا جج سمجھیں ہاں اگر اُس نے دہلی میں جنم لیا ہے۔ یہاں کی مختلف صحبتیں دیکھی ہیں۔ شعرا و علما کی خدمت میں رہا ہے۔ غیر جگہ کے محاورات کو اُس نے اپنی زبان پر چڑھا کر اُردو میں نہیں ملایا ہے۔ تو بیشک وہ اہلِ زبان اور یہاں کی زبان کا قاضی القضات ہے۔ اسمیں اگر کوئی جھنجھانوی درک دے تو ہم کھلے خزانے کہ سکتے ہیں کہ یہ ناحق کی جھنجھٹ ہے۔ اور جو کوئی لاہوری اہلِ زبان بننے کا دعوے کرے تو ہم اِن دلیلوں سے آگے دلیلیں مانگیں گے۔ اور اُنہیں توڑ توڑ کر اُنہیں کی زبان میں یہ کہینگے

لاہَوَر۔ لاہَور یعنی ابھی اور دلیلیں پیش فرمائیے یہ مکتفی نہیں ہیں۔

ہم نے یہ جو کچھ لکھا ہے۔ حُبِّ الوطنی اور واقعی حالت کی مناسبت سے لکھا ہے۔ جس طرح ہمارے دوست وجاہت نے اپنی وجاہت دکھا کر لاہور میں رہنے کا حق ادا کیا ہے۔ اِسی طرح ہم نے بھی اپنی تحقیقات اور معلومات کے اظہار سے اپنے شہر کو مرکزی حقدار ثابت کیا ہے۔ وگرنہ ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بقول سعدی علیہ الرحمۃ۔ ؎

ندانی کہ مارا سرِ جنگ نیست  وگرنہ مجالِ سخن تنگ نیست

ورنہ یہ مضمون اور اسکی ایک ایک شاخ ایک ایک کتاب سے کم نہ ہوتی۔ اِسکے ماسوا ہمیں اپنے دوست سے کچھ پرخاش بھی نہ تھی۔ جسطرح اُنہوں نے اپنی دانست میں نیک نیتی سے کام لیا ہے۔ اِسی طرح ہم نے بھی انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ منتصرانِ زبان دونوں کے مضامین سامنے رکھکر آپ فیصلہ کرلیں گے۔ کہ کون غلطی پر ہے۔ اور کون راستی پر۔ کس نے پھیر کا رستہ اختیار کیا ہے۔ کس نے سیدھا۔ اور یوں تو۔ ؎

کس نگوید کہ دوغِ من ترش است ٭ اپنی اپنی دانست میں وہ بھی حق پر ہیں اور ہم بھی۔ ؎

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم  کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

خیر آپس کی سر پھٹول تو چلی ہی جائے گی۔ مگر دیگر مخالفانِ زبان کی نسبت ہم اخیر میں اتنا کہدینا اور مناسب جانتے ہیں کہ ہمارے **اسلامی بھائی** دراصل ہندوستانی شائستہ۔ اور مہذب

مادری زبان کو اُردو کہتے ہیں۔ اس سے پیشتر **برج بھاکا** اُس کے بعد ریختہ اور آخر میں اُردو کہنے لگے تھے۔ دہلی کا اردو بازار اب بھی کچھ کھنڈر لئے کھڑا ہے۔ جس کی بڑی وجہ اُسمیں مختلف زبانوں کی ایک خوبصورتی۔ تناسب و خوش اسلوبی کے ساتھ آمیزش ہے اور اسی آمیزش نے اُس کا نام اُردو ڈال دیا۔ کیونکہ اُردوئے معلّٰی کہتے کا اب زمانہ نہیں رہا۔ لفظ معلّٰی اسکا جانی دشمن اور لفظ شاہجہاں اِس کے خون کا پیاسا ہوگیا ہے۔ اِسکے علاوہ یہ زبان باقاعدہ ہے۔ بالترتیب ہے۔ عام فہم ہے۔ سہولت پسند ہے۔ علم ادب۔ علم عروض۔ علم تاریخ وغیرہ کی بلحاظ تصانیف مختلفہ جان ہے۔ ایک زمانہ میں یہی شاہی زبان تھی۔ مگر اور **قومیں** جن کو اہل اسلام۔ اور شاہانِ اسلام سے تعلیم موجودہ نے نفرت دلادی ہے۔ وہ ہماری اِس مادری زبان کو اُردو لقب سے ملقب ہونا پسند نہیں کرتیں۔ اور اِسے خاص اسلامی زبان قرار دیتی ہیں جس کا سبب میرے نزدیک صریح ہٹ دھرمی اور نری مذہبی پچ کے سوا دوسرا نہیں ہے۔ نیز فرقہ آریہ کا یہ ایک ادنے کرشمہ ہے۔ اگر نظرِ تعمّق سے دیکھا جائے تو جسے اُردو کہتے ہیں۔ اُس میں سب سے بڑا حصہ ہندی۔ پراکرت۔ پالی اور سنسکرت کے سالم یا بگڑے بگڑائے الفاظ کا ہے۔ اِس کے بعد فارسی کا۔ فارسی کے بعد عربی۔ ترکی۔ یونانی۔ پرتگالی۔ کا بقدر وسعت آور فی زمانہ انگریزی الفاظ دریائے زخّار کی روبنکر اِس طرح اِسکی رگ رگ میں دوڑ رہے ہیں کہ کوئی جگہ خالی نہیں چھوڑی۔ کوئی دن جاتا ہے کہ اس اُردو کو شاہجہانی اُردو کی بجائے انگلستانی یا گرانی اُردو کہیں گے۔ مگر نہیں جو اس زبان کے اہل۔ اِس کے جوہری اور نقّاد ہیں وہ کھرے کھوٹے کو پرکھ پرکھ کر لے رہے ہیں۔ میل کھاتے ہوئے الفاظ کو جوں کا توں اور اُکھیڑ کی لیتے ہوئے الفاظ کو ٹھیک بناکر اپنی زبان میں ملا رہے ہیں سپٹمبر کو ستمبر۔ فیبروری کو فروری۔ کلکٹر کو کلٹر۔ اسٹامپ کو اسٹام۔ لائن کو لین۔ آرڈرلی کو اردلی۔ بوٹل کو بوتل۔ ریکروٹ کو رنگروٹ۔ رائفل کو رفل۔ کمانڈر کو کمانیر۔ لونگ کلوتھ کو لٹھا۔ سفر مینا۔ سیپرز اینڈ مائنرز کو۔ ڈمی کو گمٹی۔ لینٹرن کو لالٹین۔ ڈپیوٹی کو ڈپٹی۔ سینٹری کو سنتری۔ ڈزن کو درجن۔ ٹون ڈیوٹی کو یون ٹوٹی۔ سیلج کیرج کو سیج گاڑی۔ کرکے کس خوبصورتی سے اپنی زبان کا مانوس جزو بنالیا ہے۔ جو لوگ اُردو کے خمیر۔ اِس کی ترتیب اور موزونیت الفاظ سے واقف ہیں۔ وہ اِس قسم کا تصرّف کئے بغیر نہیں رہتے سیکریٹری کو جب کہیں گے سکتر ہی کہینگے۔ لارڈ کو لاٹھ لیفٹیننٹ کو لفٹنٹ۔ کرنل کو کرنیل بولیں گے۔ اب فرمائیے اِسمیں انگریزی کے تلفّظ نے بگڑ کر اپنی زبان سے کون سی مغائرت کرلی۔ انگریزی بھی جن کلیم

ہوئے اور اُردو کے اہلِ زبان بھی گھر کے گھر رہے۔ ثقیل و غیر مانوس الفاظ کو گھڑ گھڑ کر اپنی زبان کا ہم رشتہ بنایا۔ جس طرح کوئی بڑھئی کسی بیڈول اور ان گھڑ لکڑی کو چھیل چھال کر سڈول اور موزوں بنالیتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے الفاظ کو تراش خراش کر خوشنما بنالیا۔

اب جھگڑا ہے تو صرف لفظِ **اردو** کا جھگڑا ہے۔ لیکن اس کو مذہبی پہلو پر لیجانا اور مذہبی قیود کا ایک جزو بنا کر اُسے مغلوب کرنے یا مٹانے کے درپے ہو جانا۔ ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت پر بیٹھکر اپنی ہی طرف سے اُس کا ٹہنا کاٹنا اور خود گر کر پچھتانا۔

اس زمانہ میں نہ تو پیور ہندی ہی بول چال میں باقی ہے نہ خالص اُردو۔ اگر اس مخلوط زبان کو کوئی ہندوستانی کہے تو کچھ حرج نہیں اور جو کوئی اردو زبان سے تعبیر کرے تو بھی کچھ اعتراض نہیں۔ کیونکہ بے غش نہ ہندوستانی زبان رہی نہ اُردو۔ ہر ایک مرکب ہوگئی اور ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ برج بھاکا۔ جو ایک رسیلی۔ ولولہ انگیز۔ سلیس اور فصیح زبان تھی اب وہ بھی اپنی اصلی حالت پر نہ رہی مگر پھر بھی اُسکی آن لبھائے بغیر نہیں رہتی۔

مسلمانوں میں پردہ نشینوں۔ علم سے بے بہرہ عورتوں میں اور برج میں وہاں کی دیہاتی آبادیوں میں خالص زبان کا پتا چلتا ہے۔ ورنہ اس زمانہ کی مردانہ تصنیف نے عورتوں کی زبان کو بھی کچھ سے کچھ کر دیا۔ جس سے دن بدن زبان کا لطف اُٹھتا اور اصلیت کا معیار گھٹتا چلا جائے گا۔ مردانہ زبان میں رسالوں۔ اخباروں وغیرہ کا لکھا جانا اور عورتوں کے واسطے اُنہیں مخصوص بنانا خالص زبان کے ساتھ علانیہ دشمنی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عورتوں کو پڑھاؤ لکھاؤ نہیں۔ مگر یہ ضرور کہتے ہیں کہ اپنے الفاظ کا مفہوم سمجھا کر اُن سے اُنکی زبان کے سے پیارے اور میٹھے الفاظ بنواؤ۔ انگریزی لیڈیوں کے سے ملائم نرم اور نازک الفاظ اُنکی خلقت کے موافق رواج دو اور دلواؤ۔ تازہ گھڑے ہوئے الفاظ کو منہ نہ لگانے دو۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ نکتہ کی بات سُنو اور اس پر صاف دل سے عمل کرو۔ دیکھو زبان کو مذہبی پالا بنانا آیندہ کی ترقی۔ علمی۔ کتابی اور درباری زبان سے دیس نکالا دینا ہے۔ اگر ایک قوم اس کا نام اردو قائم رکھے جو درحقیقت اُس کا صحیح لقب ہے اور دوسری قوم اسے ہندوستانی زبان کہے جو دراصل کچھ بیجا نہیں ہے تو ہمارا کیا نقصان ہے۔ کیونکہ یہ زبان کچھ آج سے نہیں آٹھ نو سو برس سے مخلوط ہو کر گرگٹ کے سے رنگ بدل رہی ہے۔ سنسکرت اور ہندی بھاکا بلحاظ ماخذ ایک اور باعتبارِ

زبان دو جداگانہ زبانیں ہیں۔ بقول فاضل سنسکرت میکسمولر ہندی۔ ملکِ ہندوستان کی ایک زندہ زبان ہے۔ اور سنسکرت یعنی ویدوں اور برہمنو کا لٹریچر ایک دوسری مردہ زبان ہے۔ گو اسکی اصل وہیں ہے ہے جہاں سے سنسکرت نے خروج کیا ہے آجکل کی اُردو کی نسبت سرلائل جیسے محقق زبان کی بھی یہی رائے ہے کہ "یہ دراصل سولھویں صدی کی ہندی ہے۔ جسمیں حسب ضرورت فارسی الفاظ مل گئے ہیں"۔

مسلمانوں نے جس شوق سے ہندی الفاظ کا ذخیرہ اپنی زبان اور اپنی روزمرہ میں خزانہ سمجھکر بھرا دوسری قوم اور خاصکر ہند کی آریہ قوم نے اُسکے پاسنگ بھی ان کی زبان کی طرف توجہ نہیں کی اگرچہ سکندر لودھی کے زمانہ سے فارسی میں سب سے اول کالیستھوں نے اپنا قدم رکھا مگر اُن کی فارسی بھی ایک خاص طرز اور ہندی لہجہ آمیز فارسی ہوگی مسلمانوں میں سب سے اول مقام غزنہ سے ہند میں آکر جس شخص نے ہندی ضخیم دیوان لکھا وہ امیر سعد اللہ مسعود غزنوی تھا جسکی نسبت محمد عوفی اپنے اُس تذکرہ میں جو ۶۰۰ھ ہجری میں لکھا گیا اسطرح سخن سرا ہوتا ہے۔ کہ اُسکی تین دیوان ہیں۔ ایک عربی میں۔ دوسرا فارسی میں۔ تیسرا ہندی میں حضرت امیر خسرو اپنی کتاب غرۃ الکمال میں اس امر کی تصدیق فرماتے اور اُسکے تینوں ضخیم دیوانوں کی از حد تعریف کرتے ہیں تقی کاشی کا بیان ہے کہ امیر مسعود غزنہ میں پیدا ہوا۔ یہ شخص اُمرا و عمائد غزنوی میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو غزنی کا بخشی اور میرمنشی رہا تھا۔ سنائی اسکی تعریف میں لکھتا ہے۔ ؎

اے عمیدے کہ باز غزنی را　　صورت و سیرتت گلستان کرد

حضرت امیر خسرو کے زمانہ میں امیر مسعود کے ہندی شعر مشہور تھے۔ ابو ریحان بیرونی کی کتاب الہند جو محمود غزنوی کے وقت میں لکھی گئی۔ اور اُسکی سنسکرت کی لیاقت۔ علم جوتش۔ ہندی فلسفہ کی کماحقہ واقفیت دیکھیے جس نے ۴۳۰ھ ہجری میں میں انتقال فرمایا۔ کبیر کے موحدانہ بھجن پڑھیئے۔ محمد جائسی کی پدماوت بھاکا کا ملاحظہ فرمائیے۔ امیر خسرو دہلوی کے چوچلے بھری ہندی تصانیف پر نظر ڈالیے عبدالرحیم خاں خانخاناں فیضی۔ فیاضی۔ عبدالجلیل بلگرامی کی سنسکرت دانی کی داد دیجیے۔ جعفر زٹلی کی ہندی زٹل۔ عبدالرحمان دہلوی کی کتاب جگ بستک یعنی ضلع جگت دارا شکوہ کی ہندی و سنسکرت سے واقفیت پر توجہ فرمائیے۔ شمس العلما مولوی

**سید علی بلگرامی** سلمہ اللہ تعالیٰ کی سنسکرت پر بلا مبالغہ غش غش کیجئے اور دیکھ لیجئے کہ مسلمانوں کو اس زبان سے خاص اُنس اور دلچسپی رہی ہے یا نہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ۳ مئی سنہ ۱۱ء کو رحلت سے داغ مفارقت دے گئے

مقطع کا بند یہ ہے کہ **ہندوستانی** زبان اور **اُردو** زبان ایک ہی ہے صرف تراش و خراش۔ اسلوب تربیت و ترکیب اور دلچسپی کا فرق ہے۔ جسکے سبب ریختہ اور ہندوستانی زبان کہنے کے بجائے اُردو زبان کہنا نہایت موزوں ہے جو ہر ایک زبان کے اختلاط کا نتیجہ اور اُس کا مزید ارپھل پیش کر رہی ہے۔ ہاں۔ ضد۔ ہٹ۔ تعصب کی دھندلی عینک ان خوبیوں کو کیونکر ٹھنڈے پیٹوں دیکھنے دیگی۔

ہمارے نزدیک جو لوگ اُردو زبان سے نفرت کر کے اِس کی بول چال۔ اندازِ گفتگو۔ طرزِ لب و لہجہ کو بگاڑیں گے۔ وہ اپنی ہنسی آپ اُڑائیں گے۔ غیر ملک کا کوئی فصیح۔ کوئی بلیغ۔ کوئی عالم۔ کوئی فاضل۔ کوئی مُصنّف۔ کوئی لکچرار۔ اس زبان کی بے ترتیبی۔ انمیل الفاظ۔ عجیب ترکیب و غریب انشا پردازی کو دیکھکر تمسخر کئے بغیر نہ رہیگا۔ رنگروٹی زبان کا خطاب دیکر چلا جائیگا۔ اس کی انشا پردازی نفرت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اور اِس کی خوش بیانی سرتاسر اوچھوں اور جاہلوں کی بولی ثابت ہو گی۔ ادھر پادریوں نے اُدھر آریاؤں نے اُردو کو اُردو کیا۔ ہندوستانی زبان بھی نہ رکھا۔ اِن کی تصانیف دل پر بوجھ ڈال کر پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ نہ وہ کتابی زبان ہے۔ نہ روز مرّہ کی بول چال۔ اردو زبان کے علمی۔ درباری اور مہذب زبان ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ اِسکے بالمقابل اگر کوئی اور زبانِ عام یا مُلکی زبان ہے اور وہ ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک اُردو کے الفاظ کی آمیزش کے بغیر بولی جاتی ہے تو اُس میں کثرت سے تصنیفات بھی ہوگی۔ اور رسالے یا اخبارات بھی بافراط نکلتے ہوں گے۔ تاریخی ذخیرہ اُس میں ہو گا۔ سفرناموں کا خزانہ اُس میں ملیگا غرض ہر قسم کی کتابوں اور تصانیف سے معمور ہو گی۔ اور جو اُس میں نہ تو ایسا ذخیرہ ہو گا اور نہ وہ عام بولی ہو گی۔ اور نہ کوئی اُسے آسانی سے سمجھ سکیگا تو کسی عقلمند کے نزدیک بھی وہ مُلکی زبان کا استحقاق نہیں رکھتے گی۔

تعجب یہ ہے کہ جو لوگ اُردو کو نکّو بناتے اور حقارت کی نظر سے چھپی چھپی کر کے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی بول چال میں صرف چند ہندی یا سنسکرت بے میل الفاظ ملا کر بولنے پر مجبور رہ ہی جاتے ہیں۔ غرض اِس بحث سے اور کچھ ہو یا نہ ہو مگر ہمارے مُلک کی

زبان کا ستیاناس غیر قوموں میں جاکر ضرور ہو جائیگا۔ اگر دونوں قومیں مل گئی ہیں اور دل سے ملی ہیں تو اس زبانی جدید امتیاز کو درمیان سے اٹھا دیں۔ اردو اور ہندوستانی زبان کو ایک ہی سمجھیں اور درحقیقت ہیں بھی دونوں ایک ہی مرکب زبان۔ آگے اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی سمجھ۔

اس کے ساتھ ہی دیوناگری میں لکھنے کا مسئلہ بھی چھڑا ہوا ہے اور حکام وقت کو صحیح تلفظ زود نویسی۔ اور درست تحریر کے لئے اس سے بہتر حروف نہیں بتائے جاتے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اس میں زود نویسی کہاں سے آگئی۔ اول تو ہر ایک حرف کی پوری شکل بنانی پڑتی ہے دوسرے اسکا کوئی اختصاری قاعدہ مقرر نہیں ہے۔ مگر اردو حرفوں میں ابتدا ہی سے شورٹ ہینڈ کا قاعدہ ڈال کر پورے پورے حرفوں کی شکلوں کی بجائے حرفوں کے صرف سروں۔ شوشوں یا نقطوں سے کام لیا ہے۔ بلکہ نقطوں کے بغیر بھی نقطوں کا کام نکل جاتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ عاقلان بیر دئی نقطہ نکنند پس اختصار کے حق میں بھی اردو رسم الخط نہایت موزوں ہے۔ اور اس اختصار کا ہم لوگ چاہیں تو اور اختصار بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ ناگری میں یہ بات کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔

اس میں عربی۔ فارسی الفاظ کا املا کیونکر درست ہوگا جس میں الف کی بجائے عین۔ عین کی بجائے الف۔ صاد کی بجائے سین اور سین کی بجائے صاد۔ علی ہذا ضاد کی بجائے زے اور زے کی بجائے ضاد کچھ سے کچھ معنی پیدا کر دیتا ہے اگر یہ کہو کہ ان الفاظ کی ضرورت ہی کیوں پڑے گی۔ تو ہم اس کو جب تک قانونی کتابوں کا ترجمہ اردو میں موجود ہے جب تک عدالتوں کی پرانی اور نئی مسلیں ثابت ہیں۔ جب تک صیغہ مال کے رجسٹروں میں جاگیریں اور زمینوں کے نام ہیں۔ جب تک یونیورسٹیوں میں اس زبان کا کچھ نہ کچھ رواج ہے برابر عربی۔ فارسی۔ ترکی الفاظ کی ضرورت پڑے گی۔ مچلکہ ترکی لفظ ہے۔ مگر کس قدر مستعمل ہے اجارہ عربی لفظ ہے مگر ہندی ٹھمریوں تک میں موجود ہے۔ مثلاً ؎

ایسے تم ہی ہو گیا؟ برج کے اجارہ دار موری انگیا کے کردینے تار تار

چسپاں فارسی لفظ ہے۔ مگر لفظ ٹمن چسپاں کرنے کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے علے ہذا غرضی۔ دعوے۔ قرقی۔ طلبانہ۔ شجرہ بہتیری مثالیں ہیں۔ ہماری رائے میں اگر تبدیلی بغیر چارہ ہی نہیں اور نستعلیق سے بھی ناگری حروف بڑھ گئے ہیں تو ناگری کی بجائے

رومن کا جاری ہونا حاکم و محکوم دونو کے واسطے مفید ہے۔ رومن ناگری کی نسبت انگریزی حروف میں جلدی بھی لکھی جاتی ہے۔ اور ایک حد تک تلفظ بھی بہت صحیح ادا ہوتا ہے۔ بعض علامتیں جو مقرر ہو گئی ہیں اُن پر خیال رکھنا کافی ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ زور کے ساتھ یہی کہتا ہے۔ اور یہی دکھا دیگا۔ کہ حکّام کو سب سے زیادہ وقت ناگری کی روائی میں صرف کرنا پڑے گا۔ اور گزشتہ سارا انتظام درہم برہم ہو کر بہت کچھ رعایا سے واویلا مچوائیگا۔ اُردو اور ہندوستانی زبان کو فارسی کے نستعلیق خط کے ساتھ ایک خاص مناسبت اور موزونیت ہو گئی ہے۔ شکستہ لکھنے والوں اور کچے عدالتی محرّروں نے بیشک اسمیں دقّتیں پیدا کر دی ہیں۔ تا وقتیکہ عدالتوں میں۔ اسکولوں میں خوشخطی لازم نگردانی جائے گی یہی دقّتیں پیش آتی رہیں گی۔ جس قدر ہماری زبان کی تصانیف اور اخبارات یا رسائل ہیں وہ نستعلیق میں لکھے جاتے اور آسانی سے پڑھے جاتے ہیں۔ نہ تلفّظ میں غلطی ہوتی ہے نہ اُن کے قیام و روانی کے جملوں میں ہمزہ۔ پیش۔ زیر۔ زبر وغیرہ کی ساری صورتیں بنی رہتی ہیں۔ اگر یہ زبان دوسرے خط میں لکھی گئی۔ تصانیف کی صحیح قرأت نا ممکن اور بے لطف ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ سچے دلی اثر کو اس ناقص ادائے تلفظ سے بالکل بے بہرہ کر دے گی۔ فقط

سیّد احمد دہلوی ۱۲- فروری سنہ ۱۹۱۱ء

# گزارش شکریہ

صرف دہلی کے اہلِ زبانوں کو کیا۔ بلکہ اُردو کے کُل ہوا خواہوں اور قدردانوں پر واجب ہے کہ وہ جناب شیخ محمد اشفاق صاحب دہلوی تاجر نامی گرامی کے تہِ دل سے شکر گزار ہوں جن کی کوشش و فرمائش سے یہ رسالہ مشتہر ہوا۔ گو بظاہر یہ ایک محاکمہ ہے۔ مگر در حقیقت اردو زبان کی معلومات کا خزانہ ہے جو حامیانِ اُردو کو ہر طرح سے مدد دیتا رہیگا۔ اور چند روز بعد غالباً ڈھونڈے میسر نہ آئیگا۔ کیونکہ کثیر تعداد میں طبع نہیں ہوا ہے۔ فقط۔

سیّد احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ وغیرہ وغیرہ

اِس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ اور اپریل ۱۹۱۰ء کے رسالہ **مخزن** میں جو شاہی **کھانوں** کے نام چھپے ہیں۔ وہ اِسی سے نقل ہوئے ہیں خان بہادر شمس العلماء مولوی **محمد ذکاء اللہ** صاحب نے بھی اِسپر ایک بسیط ریویو لکھا ہے جو رسالہ **صلائے عام** مطبوعہ ماہ رمضان ۱۳۲۷ھ ہجری میں زور شور سے مع نقل فرکرہ رمضان المبارک طبع ہوا ہے اگرچہ پہلے یعنی ۱۸۸۵ء میں اِس نایاب کتاب کی قیمت پانچ روپے تھی اور اِس پر بھی ڈھونڈے نہیں پاتی تھی مگر اب شائقین حالات خاندان شاہی کے زور دینے اور شوق ظاہر کرنے سے منشی سید احمد صاحب دہلوی مالک کتاب مذکور نے نہایت کوشش اور تجسس سے جا بجا تلاش کرکے کچھ نسخے بہم پہنچا کر بنظر رفاہ۔ مجلد کے صرف دو روپے چار آنے اور غیر مجلد کے دو روپے پختہ قیمت مقرر کردی ہے البتہ ڈاک و رجسٹری وغیرہ کا خرچ بذمہ خریدار رہے جن صاحبوں کو یہ **عجوبہ روزگار شاہی یادگار** درکار ہو وہ بہ ترسیل قیمت یا بذریعہ ویلیو پی ایبل دفتر فرہنگِ آصفیہ واقع دہلی کوچہ پنڈت سے طلب فرمائیں۔ ورنہ پھر پچھتاتے اور ہاتھ ملنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ قیمت ۲ع ۸ع

**فرہنگِ آصفیہ** یعنی (نہایت بسیط و وسیع ہندوستانی اور اردو زبان کی مکمل لغات) یہ ہندوستانی اور اردو زبان کی ایک بہت بڑی لغات ہے جو چار جلدوں میں دو ہزار پانچسو پانچ کلاں صفحوں پر اکیس برس میں تالیف ہوکر طبع ہوئی ہے۔ اِس لغات میں صرف اردو۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی۔ ہندی اور انگریزی مخلوط بہ اردو الفاظ ہی نہیں بلکہ بہت سے تاریخی حالات متعلقہ لغات۔ اصطلاحات۔ محاورات۔ وغیرہ درج ہیں۔ **اولیائے ہند۔ فقرائے ہند۔ علمائے نامی۔ شاعرانِ** گرامی کے تذکرے اور مثالیہ اشعار و ضرب الامثال بھی بکثرت مندرج ہیں۔ **تذکیر و تانیث۔ لازمی و متعدی** افعال۔ ضروری الفاظ کے **مادے اور زمانوں** کا امتیاز بھی اِس فرہنگ سے ہوتا ہے اکثر فرقوں یعنی اہلِ پیشہ و اہلِ حرفہ کی خاص خاص اصطلاحیں بھی اسمیں اکثر ملتی ہیں۔ بیگماتی زبان اِسمیں موجود ہے۔ علمی زبان کا لطف اِسکے دیباچہ اور مقدمۂ قدیم و جدید سے اِس میں آتا ہے۔ **صرف و نحو** کی یہ معاون ہے غرض چون ہزار سے زیادہ الفاظ کا مجموعہ ہے۔ ہر صوبہ کی گورنمنٹ **انگریزی** نے اِسکی قدردانی فرمائی معتدبہ خریداری کے علاوہ پانچ سو روپے کا انعام مرحمت فرمایا ہے ۔ اِسکے علاوہ عالی جناب معدلت مآب شاہ دکن ملک دکن عالی مقام حضور **نظام** خلد اللہ ملکہ نے سب سے زیادہ اِسکی دستگیری فرمائی۔ ساڑھے پانچہزار روپے کا انعام نو ہزار کی خریداری کے علاوہ تین ہزار روپے ہمتقطیع کردینے کو مرحمت فرمائے اِسکے ماسوا ۱۸۹۶ء سے پچاس روپے ماہوار کا وظیفہ بھی مقرر کردیا۔ پختہ قیمت چالیس روپے محصول بذمہ خریدار ہے۔ اِس کے مصنف نے جو قومی اور ملکی خدمت کی ہے وہ اِس قابل ہے کہ جبتک وہ زندہ رہے۔ اُس سے برابر اِس کی ترمیم اور افزونی نیز تازہ معلومات میں کام لیا جائے۔ اُسکی ہمت بڑھانے کو صرف خریداری سے ہی دستگیری کافی ہے۔ کیونکہ اب وہ اپنی محنت کا اِس سے زیادہ صلہ نہیں چاہتا ۔

(بقیہ بہ صفحہ ۳ ٹائیٹل)

**نقشہ سواریٔ جلوس**۔ اکبر شاہ ثانی مع اسمائے
اشیائے جلو۔ قیمت ۴ر

**نقشہ** دربار عام۔ قیمت ۲ر

## کتب احباب

**تذکرہ ہزارداستاں** معروف بہ **خمخانۂ جاوید**
مرتبہ لالہ سری رام صاحب۔ ایم۔ اے۔ سابق منصف
دہلی جو نہایت تحقیق و جانفشانی سے پندرہ ۱۵ سولہ ۱۶ برس میں
تیار ہوا ہے حصہ اول قیمت بہ تفاریق کاغذ مجلد ۵؎ر
و قسم دوم للعہ

**جلد دوم**۔ مجلد ۵؎ر قسم دوم مجلد للعہ بلا جلد ۳ر

**مہتاب داغ**۔ مصنفہ نواب فصیح الملک بہادر نواب مرزا
**داغ** استاد حضور نظام خلد اللہ ملکہ بتفاریق کاغذ ۳ر

**دیوان انور**۔ مصنفہ جناب نواب امراؤ مرزا صاحب مرحوم
شاگرد حضرت ذوق ۱۲ار

**گلدستہ مضامین حصہ اول**۔ مرتبہ ماسٹر عبداللہ
خاں صاحب پسند شدۂ ٹکسٹ بک کمیٹی لاہور ۴ر

**حکایات عجیب**۔ ایضاً ۔ ۔ ۔ ۴ر

**عجیب و غریب لطیفے**۔ ایضاً ۔ ۔ ۔ ۶ر

**سلسلۂ حساب نمبر ا** یعنی قاعدۂ حساب۔ نہایت
سہل عجیب اور دلنشین قاعدوں سے ماسٹر صاحب ہی نے
تیار کیا ہے۔ یہ سارا سلسلہ نئی طرز پہ جدید انگریزی
تصنیفات سے اخذ ہوا ہے۔ تمام پنجاب نے اس کی
قدر دانی کی اور ٹکسٹ بک کمیٹی نے بھی اس سلسلے کے
اکثر نمبر منظور فرمائے ہیں۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۴ر

**سلسلۂ حساب نمبر ۲و۳** ہر یک فی جلد ۴ر

**سلسلۂ حساب نمبر ۴۔ نمبر ۵**۔ ہر یک فی جلد ۵ر

**سلسلۂ حساب نمبر ۶** ۔ ۔ ۔ ۶ر

**سلسلۂ حساب نمبر ۷** ۔ ۔ ۔ ۸ر

**مشقی سوالات سلسلۂ نمبر ۲۔ نمبر ۳**۔ ہر یک فی جلد ۴ر

**مشقی سوالات سلسلۂ نمبر ۵** ۔ ۔ ۔ ۵ر

## اردو ترجمہ تاریخ ابو الفدا

ہمارے ایک دوست کے پاس اس عنقا تاریخ مترجمہ
مولوی کریم الدین مرحوم مطبوعۂ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۶ء
کی قلیل تعداد میں ہر سہ جلدیں موجود ہیں۔ اگر کوئی تاجر
یکمشت خریدے تو بکفایت ورنہ یہ مکمل تاریخ پانچ روپے
پیشگی قیمت آنے پر مل سکتی ہے۔ محصول بذمۂ خریدار
جو ایک روپیہ کے قریب ہوگا۔ پہلے اس کی قیمت للعہ تھی۔

## مستند فرسنامہ یعنی سلوتری کی کتاب

گھوڑوں کی شناخت۔ ان کی بیماریوں کے مجرب
علاج ہر قسم کے گھوڑوں کا عیب و صواب مع تصاویر
صحیح اس ضخیم کتاب میں موجود ہے۔ مؤلف کی محنت
قابل داد اور ہر تصویر کی صحت پر اہل بصیرت کا
صاد ہے۔ قیمت فی جلد ۲ر۔ محصول بذمۂ خریدار

## اردو ہومیوپیتھک

یہ ۴۰۰ صفحے کی کتاب ڈاکٹر محمد عبد الباسط صاحب
ایک نامی گرامی ڈاکٹر کی مترجمہ ہے جو نہایت زور

ڈالنے اور فرمائشوں کی بھرمار کرنے سے لکھی گئی ہے۔ تشخیص امراض۔ افعال و خواص ادویات کو خوب تصریح اور تحقیق سے لکھا ہے۔ پہلے اس کی قیمت آٹھ روپے تھی۔ مگر اب پانچ روپیہ کردی ہے۔ محصول بذمۂ خریدار صرف چند جلدیں باقی ہیں ؂

## رسالۂ قوافی

اگرچہ علم عروض میں بہت سے رسالے چھپ چکے ہیں۔ مگر صرف قوافی کے بیان میں مع نظائر اب تک کوئی ایسا مکمل رسالہ طبع نہیں ہوا قیمت مع محصول ۲؍

**تاریخ دکن** کلاں رشید الدین خانی برحاشیۂ تاریخ خورشید جاہی مطبوعۂ دکن ... ... ... ... ۵ روپیہ

**بہار عجم** در مصطلحات فارسی جلد اول و دوم مجلد مطبوعۂ مطبع سراجی دہلی برحاشیہ غیاث اللغات ... ... ۵ روپیہ

**سنبلستان** فارسی مصنفہ مرزا ہرگوپال تفتہ در جواب بوستان عمر

**دیوان تفتہ**۔ فارسی کلاں مجلد ... ... ۵ روپیہ

**نیا علم شفابخشی** یعنی علاج بے دوا جلد اول و دوم ۳؍ نیز جلد سوم و چہارم قیمت ۲؍

## اشتہار

بابو چھنامل صاحب پروفیسر ساکن دہلی گندی گلی نے ہمارے تجربہ کے واسطے سُرمہائے ذیل ارسال فرمائے ہیں۔ جن پر خان بہادر منشی ذکاءاللہ اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب کی ہم سے بہتر تصدیق موجود ہے اور ہمیں بھی اُن کی رائے سے اتفاق ہے ؂

ممیرہ کا سرمہ سیاہ فی تولہ ۲؍ ممیرے کا سرمہ سفید فی تولہ ۳؍ کافوری سرمہ فی شیشی ۸؍ ممیرا خالص فی ماشہ ۲۰ روپیہ ۲۰ روپیہ فی ماشہ کافور کا منجن۔ فی چھٹانک ۸؍

## نکات الحساب

اسکی خوبی اس کے نام سے ظاہر ہے۔ چند نسخے باقی ہیں قیمت مع محصول ... ... ... ۶؍

## تحفۃ الابرار

یہ کتاب صوفیہ کرام کے حالات۔ چار پیر چودہ خانوادوں اور اُن کی شاخوں کے بیانات میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ دو سَو مستند کتابوں کا خاص معاونات کے ساتھ لاجواب انتخاب ہے قیمت فی جلد للعہ

## تنبیہ

ہر ایک خریدار کو اپنا نام۔ مقام۔ ڈاکخانہ نیز ریلوے اسٹیشن صاف ممتاز قلم سے خواہ اردو ہو خواہ انگریزی لکھنا چاہئیے۔ ورنہ تعمیل ارشاد کے ہم ذمہ وار نہیں۔ فقط

محصول بذمۂ خریدار ؂

## مینجر

## دفتر فرہنگ آصفیہ

## دہلی

کوچہ پنڈت